زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہار سو

راولپنڈی

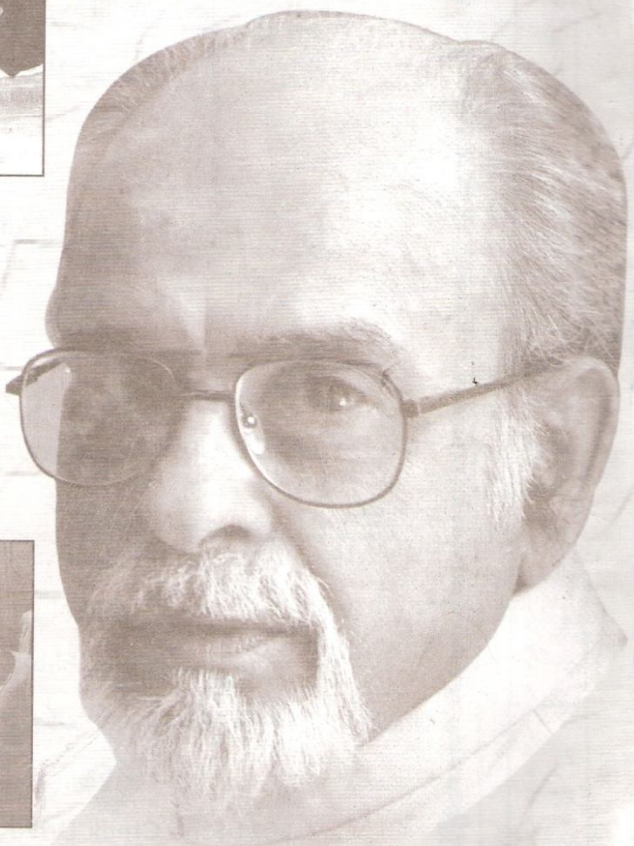

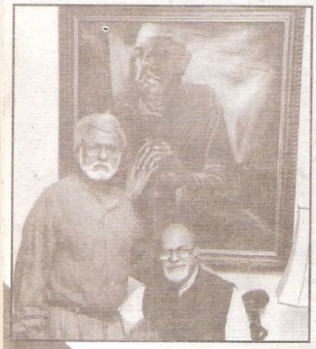

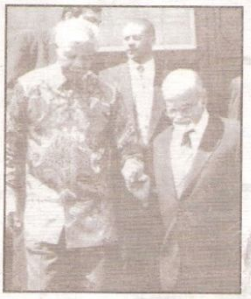

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد:۱۴ شمارا نومبر دسمبر ۲۰۰۹ء

زرِ سالانہ

حسبِ استطاعت بطور ذکوٰۃ وخیرات

مجلسِ مشاورت

قارئینِ چہارسُو

چہارسُو کا زیرِ نظر شمارا کرۂ ارض کے
بے کس و بے بس انسانوں سے
منسوب ہے
جو دنیاوی اور آسمانی آفات
کی زد میں ہیں۔

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

مدیرِ معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537 'ویسٹریج-III' راولپنڈی۔ فون: 5467235 - 92-51-5462495 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسُو

سرِ ورق، پسِ ورق..... شعیب حیدر زیدی
قرطاسِ احترام..... ادارہ ۳
معبدِ انسانیت..... قیصر الجعفری ۴
نسبِ قدیم..... ڈاکٹر کیول دھیر ۵
سرفروشی کے انداز..... اِندر کمار گجرال ۶
بلمشافہ..... گلزار جاوید ۱۰
شاہاں بہ شاہاں..... خواجہ حسن نظامی ۱۴
موجودہ دور کے نہرو..... ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ۱۶
کچھ لوگ ہیں خاموش..... خشونت سنگھ ۱۷
اِک تبسمِ گُل..... پروفیسر گوپی چند نارنگ ۱۹
بیدار مغز وزیرِ اعظم..... کلدیپ نیّر ۲۰
عہدِ جدید کے چیلنج..... ڈاکٹر قمر رئیس ۲۲
ادیب اور آج کے فرائض..... اِندر کمار گجرال ۲۳
گجرال کمیٹی: ایک جائزہ..... ڈاکٹر خلیق انجم ۲۷
لبِ شیریں..... وقار جاوید ۳۱
قرطاسِ اعزاز..... ادارہ ۳۳
براہِ راست..... گلزار جاوید ۳۴
سخن سیرابیاں..... ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ ۳۹
جادۂ شوق..... ڈاکٹر ضیاالرحمٰن صدیقی ۴۹
تشنگیوں کا شاعر..... ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۵۲
پاک باطن شاعر..... ڈاکٹر مظفر حنفی ۵۵
کس جہاں میں ٹھکانا ہے..... سلیم انصاری ۵۶
زندگی کو خطروں کا سامنا..... وشوناتھ طاؤس ۵۸

افسانہ

انتظار..... ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ ۶۱
پلکوں پہ روشن دیئے..... مصطفےٰ ملک ۶۳
سخنِ تازہ ۶۶

مشکور حسین یاد، محسن احسان، جاوید شاہین، مناظر عاشق ہرگانوی، اکبر حمیدی، رند ساغری، شاہد واسطی، عبدالرحمان عبد، علیم صبا نویدی، سرور انبالوی، حمیدہ معین رضوی، پنہاں، سلطان صبروانی، قیصر نجفی، کرشن کمار طور، غالب عرفان، ملک زادہ جاوید، خیال آفاقی، محمد ظہیر، دل نواز دل، ڈاکٹر حنیف ترین، خورشید انور رضوی، رب نواز مائل، غفار بابر، زہیر کنجاہی، اجیت سنگھ حسرت، صدیق شاہد، حصیر نوری، شگفتہ نازلی، فیصل عظیم، اوصاف شیخ، نوید سروش، امتیاز احمد، شہاب صفدر۔

افسانے

زندہ باد..... شمشاد احمد ۸۳
مانگے کی ممتا..... ڈاکٹر عمران مشتاق ۸۶
راون کی لنکا..... گلزار جاوید ۸۸

نظمِ عصر ۹۱

ستیہ پال آنند، نیر جہاں، عبدالرحمان عبد، رفعت سروش، دل نواز دل، سید عارف، قیصر نجفی، خیال آفاقی، زہیر کنجاہی، اکرام تبسم، حنیف ترین، سجاد مرزا، فیصل عظیم، شگفتہ نازلی۔

نشانِ راہ

ٹالی دے او ہلے بیہہ کے..... پدما سچدیو ۹۸

آئینۂ فن

پتھر کی میلی آنکھ..... غالب عرفان ۱۰۳
بڑی دیر ہوگئی..... نارنگ ساقی ۱۰۴
پینگ ہلارے لیندی..... پروفیسر عظیم بخاری ۱۰۶

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف..... عطیہ سکندر علی ۱۰۸
عالمی اردو کانفرنس..... ڈاکٹر تقی عابدی ۱۱۱

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین..... اعجاز کھوکھر ۱۱۳

قرطاسِ احترام

برِّصغیر کے نامور دانشور، ادیب اور سیاستدان

اِندر کُمار گُجرال

کے نام

معبدِ انسانیت

قیصرؔ الجعفری

چراغ تُو نے تراشے ہیں کہکشاں جیسے
کہ زندگی کے مراحل تھے ہفت خواں جیسے

قدم اُٹھے تو ستاروں نے پاؤں چوم لئے
اُتر پڑے تری راہوں میں آسماں جیسے

ترا شعور مہکتی ہو جیسے بادِ صبا
ترا خیال پرندہ ہو پر فشاں جیسے

یہ ہندو پاک کے قصے، یہ تیرا کلمۂ حق
ستونِ نُور ہو دونوں کے درمیاں جیسے

یہ شرق و غرب و جنوب و شمال کی دنیا
ترا خلوص کہ ہو سب کا رازداں جیسے

ہمہ جہت ہے تری شخصیت کا آئینہ
ترا وجود ہو محفل میں شمع داں جیسے

تری بیاضِ ادب ہے کہ آبروئے ہنر
قلم کی نوک پہ رکھی ہو داستاں جیسے

یہ کس مقام پہ لائی ہیں عُمر کی راہیں
کہ دشت جیسے مناظر نہ گلستاں جیسے

تو اک درخت کے نیچے اُداس بیٹھا ہے
کہاں نکل گئے بادل وہ سائباں جیسے

چھلک رہا ہے مروّت کا درد آنکھوں میں
کسک رہا ہو ابھی تیرا زخمِ جاں جیسے

تو زنگ خوردہ سیاست سے دُور ہو کر بھی
کھڑا ہے آئینہ خانے میں سرگراں جیسے

ہُوا ہے معبدِ انسانیت میں گوشہ نشیں
ترا سکوتِ بیاباں میں اذاں جیسے

وہ رات ہے کہ تری روشنی بھی پھیکی ہے
سحر تمام ہو صحرا میں رائیگاں جیسے

کوئی بتائے کہ کب صبح ہونے والی ہے
سب اتنی دیر سے بیٹھے ہیں بدگماں جیسے

میں چیختا ہوں مگر کچھ سنائی دیتا نہیں
زبانِ میرؔ کے آنسو ہوں بے زباں جیسے

یہ دل کا درد ہے، گجرال کا قصیدہ نہیں
کہ ذاتیات پرستی مرا عقیدہ نہیں

نسبِ قدیم ——————— ڈاکٹر کیول دھیر

کھتری گوجرال خاندان موضع پڑی درویزہ تحصیل سوہاوہ ضلع جہلم (پنجاب) ۱۹۳۸ء ۱۳۵۷ھ ۱۹۹۵ ب

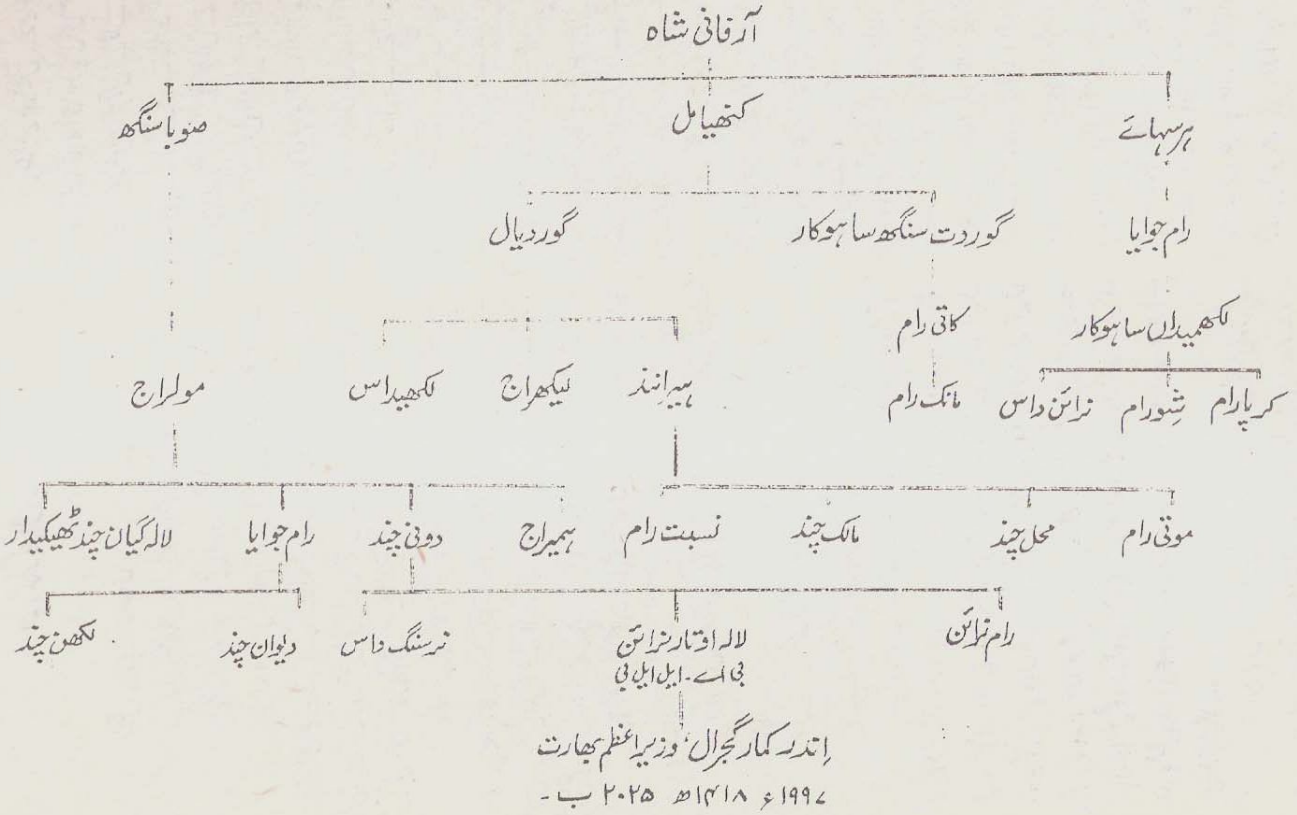

اِندر کمار گجرال، وزیراعظم بھارت
۱۹۹۷ء ۱۴۱۸ھ ۲۰۲۵ ب۔

سرفروشی کے انداز بدلے گئے

اندر کمار گجرال

فیض نے ایک دفعہ لکھا تھا۔

اب کوئی پوچھے بھی ہم سے تو کیا شرحِ حالات لکھیں
دل ٹھہرے تو درد سنائیں اور درد تھمے تو بات کریں

دسمبر ۱۹۸۳ء میں اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کے لئے مجھے بھی دعوت نامہ ملا۔ پرانے دوستوں سے ملاقات کی خواہش اور اپنا پرانا وطن دیکھنے کی پرزور کشش کھینچ کر تین دنوں کے لئے وہاں لے گئی لیکن جانے سے تشنگی بڑھی کم نہیں ہوئی۔

لاہور سے میرا خاص طور پر رشتہ بہت گہرا تھا۔ اسی شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر جوانی کا بیشتر حصہ کٹا تھا۔ وہی یونیورسٹی کی پرانی بلڈنگ، وہی میرے کالج اور ہاسٹل، وہی مزنگ روڈ پر واقع میرے سسرال کی کوٹھی جہاں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس شام کی یادیں ہوا کرائیں جب بارات میں فیض اور مظہر علی بارتی تھے۔ یہ بات تو فیض نے بھی نہ بھولی تھی۔ میری بیوی سے ملتے ہی پوچھا "اپنا گھر دیکھ آئی ہو؟"

لاہور میں ہونا رنجی بریڈلا ہال بھی اور لاجپت رائے بھون بھی تھے جہاں جھولی پھیلائے۔

فطرت نے سکھائی تھی ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے تھے وفا کے گیت یہاں چھیڑا تھا جنوں کا ساز یہاں

اور اسی جنون نے فیض سے ملاقات بھی کروائی تھی۔ اسلام آباد میں کانفرنس ختم ہوئی تو پشاور سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ فون پر بات تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اطلاع ملتے ہی فیض اور ایلس ہمارے ہوٹل آ گئے۔ یوں تو ان کی دعوت تھی کہ ہم دونوں اُن کے ہاں ٹھہریں۔ لیکن ان کا گھر ماڈل ٹاؤن میں تھا شہر سے باہر اور ہم ڈھیر بھر دوستوں سے ملنے کے متلاشی بھی تھے۔ اور اس سے زیادہ خواہش تھی ان گلیوں اور سڑکوں پر گھومنے کی جو جانی مانی تھیں۔ یوں بھی فطرتاً فیض ظاہری تکلفات سے پرہیز کرتے تھے۔ ہماری معذرت کی وجوہات ان کو معقول لگیں۔

اُن دنوں ہندوستان کی کرکٹ ٹیم بھی لاہور میں میچ کھیلنے گئی تھی۔ ہمارے سفیر کیر نے ان کے اعزاز میں ہمارے ہی ہوٹل میں ایک دعوت دے رکھی تھی۔ جوں ہی ان کو معلوم ہوا کہ فیض اور ایلس میرے کمرے میں ہیں تو سیدھے چلے آئے۔ فیض سے پہلے اُن کی ملاقات تو نہ تھی لیکن اس بہانے سے ان کا تعارف ہو گیا اور ہم سب تھوڑی دیر میں پارٹی میں جا پہنچے۔ پارٹی تو پرہیزگاروں کی تھی۔ ہر قسم کے کباب تو حاضر تھے لیکن پاکستانی قوانین شراب بندی پر مصر تھے۔ کافی دیر تک فیض کوکا کولا قسم کے مشروبوں پر صبر کرتے رہے۔

ماسکو کے بعد فیض سے میری ملاقات تو کوئی دو برس بعد ہو رہی تھی۔ چہرہ کچھ ڈھلا ہوا تھا اور چال بھی معمول سے دھیمی۔ میں نے ایلس سے وجہ پوچھی۔ کہنے لگیں ڈاکٹروں نے قلب کے متعلق وہم ڈالا تھا لیکن اب ان کی تسلی ہو گئی ہے۔ اور فیض حسبِ عادت سگریٹ کی جھڑی لگا رہے تھے۔ لیکن یہ کوئی پہلی دفعہ تو تھی نہیں کہ ڈاکٹروں نے ان کو کچھ "پرہیز" کی صلاح دی تھی۔ ماسکو میں بھی ایک دفعہ ڈاکٹروں نے اُن کو ہسپتال میں بند کر دیا تھا۔ یوں تو ان کے لئے وہاں کا قیام اچھا تھا۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد، ہاجرہ بیگم، پی سی جوشی بھی ان دنوں وہیں تھے اور ہسپتال میں اُن کی آپس میں خوب بنتی تھی۔ ایک دن مجھے فون پر کہنے لگے "بھائی جب ملنے آؤ گے تو ہماری پیاس کا دھیان کرتے آنا۔" میں نے کہا "غضب کر رہے ہیں آپ، ڈاکٹروں نے آپ کو سختی سے منع کر رکھا ہے۔" "ارے بھائی تم بھی خوب ہو، ڈاکٹروں نے مجھے منع کیا ہے آپ کو نہیں اور یوں بھی ڈاکٹر احمد ہماری مان رہے ہیں۔" لیکن غضب تو یہ ہوا ہے کہ ان کو موت اس وقت آئی جب تقریباً ایک برس سے وہ مکمل پرہیزگار ہو گئے تھے اور لوگ انہیں جو حال ہی میں لندن میں مل کر آئے تھے وہ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اب پہلے سے زیادہ صحت مند لگ رہے ہیں۔

اگلے دن شام کو ہم دونوں کھانے کے لئے ان کے گھر پہنچے۔ ایلس نے صرف اپنی دونوں بیٹیوں اور دامادوں کو بلایا تھا۔ سلیم اور منیزہ بہت پہلے بھی ہمارے پاس آ چکے تھے جب وہ بہت چھوٹی تھیں۔ اب تو اُن کے بچے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ فیض کو تو معلوم تھا کہ میں ہمیشہ سے ہی بوتل سے دور رہتا ہوں لیکن پھر بھی ہندوستانی وہسکی حاضر تھی۔ "ارے" میں نے پوچھا یہ کیسے؟ "ہم تو سنتے ہیں کہ قانون اب گھروں کے اندر بھی محتسب بھجوا رہا ہے اور پھر یہ ہندوستانی وہسکی یہاں کیسے پہنچی۔" "ارے سب چلتا ہے یہاں۔ ہم اور کون سے حکم مان رہے ہیں جو اس پر پابند ہیں۔" کراچی میں کسی نے ایک لطیفہ سنایا تھا کہ کیلے بیچنا زیادہ خطرناک ہے کیونکہ ضیاء صاحب کے راج میں اب دیواروں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ لیکن بڑی پارٹی میں آسان ہے بشرط صرف یہ ہے کہ پارٹی کے سائز کے حساب سے حسبِ عہدہ کسی فوجی افسر کو بھی مدعو کر لیجئے۔ اس دن بات زیادہ تر سیاسی موضوعات پر ہی رہی۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہند-پاکستان کے تعلقات، روس کی افغانستان میں آمد کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف تھا۔ ایلس جیسا اس میں خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اُن کے نظریہ میں یہ سب نہ ہوتا اگر حکومتِ پاکستان امریکہ کی آلۂ کار بن کر اور سوشلسٹ انقلاب کو توڑوانے کی کوشش میں شریک نہ ہوتی۔ ایک اور سوچ زیادہ تھی کہ اس

موقع پر پاکستانی پروگریسو عناصر کو بھارت سے تعلقات بحال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اُن ہی دنوں فیض بیروت سے لوٹے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی بدحالی نے ان کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس زمانے کی نظمیں اس کرب کا اظہار کرتی ہیں۔ اس شام ہم نے ان سے "فلسطینی بچے کے لئے لوری" سنی۔

ابھی کچھ ماہ پہلے دہلی میں ہم لوگوں نے فیض کے ۸۰ ویں جنم دن کا جشن منایا تھا۔ فیض صاحب کے داماد ہاشمی صاحب کہنے لگے کہ اس کا اثر پاکستان کے لوگوں پر بہت گہرا تھا۔ جتنے لوگ ہندوستان کی جمہوریت اور لبرل سماج کی باتیں کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں نے تو اس ہندوستانی ٹی وی کے پروگرام کی کیسٹس بھی بنالی تھیں۔ لیکن ہمارے یہاں کی ہی طرح فیض تو یہاں تھے نہیں۔ یہاں بھی ایک جنم دن کمیٹی بنائی گئی۔ خبر نکلتے ہی اس کے سب ارکان میرے ساتھ گرفتار کر لئے گئے اور ہم نے جنم دن پرانی انارکلی کے تھانے کے گندے سیل میں گزارا" اور پھر وہ بتانے لگے کہ "اسی تھانے میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ہمارے ساتھ نہ جانے کیوں پولیس والے ایک نوجوان مولوی کو بھی پکڑ لائے تھے۔ وہ بے چارہ پریشانی میں بہت رو رہا تھا اور بار بار کہتا کہ میں تو جنرل صاحب کا حامی ہوں، مجھے پکڑنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ ہم میں سے کسی نے کہا ارے صاحب ہم سب بھی تو ضیا صاحب کے مداح اور حامی تھے لیکن کل رات کچھ فوجی افسروں نے ضیا صاحب کو باہر کردیا ہے اس لئے اُن کے سب حامی پکڑے جا رہے ہیں۔" باہر کھڑا سنتری سن رہا تھا۔ وہ بھاگا تھانیدار کو بتانے۔ تھانیدار نے کسی کو فون کیا۔ جواب میں ڈانٹ پڑی تو ہمارے پاس آ کر کہنے لگا۔ "آپ کا یہ مذاق ہم کو تو بہت ہی کرنے والا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ افسر مہربان تھا۔" یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اگلے دن ہم واپس دہلی آ رہے تھے۔ پچھلے سال میں نے ان کو دہلی کے مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لئے لکھا لیکن قلبی دورہ آ پڑا اس لئے یہاں آنے کی بجائے ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ مظہر نے ان کی بیماری کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی وہ نظم جو انہوں نے میو ہسپتال میں لکھی تھی۔ حسب معمول اس میں کرب بھی تھا اور عزم بھی۔

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج، نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم ہو، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آ کے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر، نہ اک مہر، نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا، نہ پرایا کوئی میرا

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کی ابھی عمر پڑی ہے

فیض کی شاعری میں جہاں کرب کی گہرائی ہے، اسکے ساتھ ہی ہمت اور عزم ہمیشہ اُمید کی طرف لے جاتے ہیں۔

لمبی قید اور یہ ڈر کہ پھانسی کی سزا نہ ہو جائے، اس رجحان کو کم نہ کر پائے بلکہ ان کی شاعری کو چار چاند لگاتے رہے۔ "لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے۔" یوں تو راولپنڈی کیس سے پہلے بھی سب کی طرح کئی دفعہ اُن پر بھی مایوسی کا دور نظر آتا ہے مگر بہت کم۔

یہ غم جو ٹھاں دیتی ہے، اک طاق اگر دیں سجو گیا
ہو گیا۔

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کیوں آس لگائے بیٹھے ہو

لیکن اُن کی شاعری کی خوبصورتی یہ تھی کہ اس دکھ اور مایوسی کے پیچھے ماحول کے دکھ درد کی کہانی ہے جسے وہ خوبصورتی سے اپنے میں سمیٹ کر اور نکھار کر پیش کر دیتے ہیں۔ فیض کے اس نیاپن Lyricism اور انقلاب نے ہی ہماری پیڑھی کو ان کی طرف کھینچا تھا۔ اب تو بات بہت پرانی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی لڑائی پورے زوروں پر تھی۔ کہنا مشکل تھا کہ آخر میں ہٹلر جیتے گا یا ہارے گا۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو پورا وشواس تھا کہ اس کی تکمیل کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ میں اس زمانے میں کالج کے آخری دنوں میں تھا۔ لیکن پڑھائی سے زیادہ الجھاؤ تھا۔ بائیں بازو کی سیاست کے ساتھ تھا اور اس ناطے کبھی جیل بندی ہوئی تھی۔ ہم جیسے لوگوں کے سیاسی خواب آزادی کے بھی اگلے پڑاؤ کی سوچتے تھے اسی لئے نئے سماجی رشتے ادب اور انقلاب کے باہمی اثرات پر اکثر بحث رہتی تھی۔ اسی زمانے میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک بھی ابھر کر سامنے آ رہی تھی۔ نئے لکھنے والوں میں فیض کے خصوصی انداز کا چرچا چل نکلا تھا۔

اچانک ہی ہمارے کالج میں خبر آئی کہ فیض امرتسر چھوڑ کر لاہور ہمارے ہی کالج میں انگریزی ادب کے لیکچرر ہو کر آ رہے ہیں۔ حیرانی ہوئی کیونکہ نہ صرف ہمارا کالج سرکاری تھا بلکہ ہمارے پرنسپل انگریز تھے لیکن تھے بڑے کھلے دماغ کے آدمی۔ اُن کو تحریک آزادی کے ساتھ ہمدردی تھی، شاید اس لئے کہ فیض کے بیانوں میں ان کو کوئی پریشانی نہ تھا۔ کسی حد تک تعارف/ملاقات تو تھی ہی، تھوڑے ہی دنوں میں ہمارا رشتہ شاگرد استاد کی حد پھلانگ گیا اور ایک لمبی دوستی کی بنیاد پڑ گئی۔

Adolescence میں کئی کھچاؤ ٹیں ایک ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور ہم لوگوں کے لئے انقلاب کے کئی معنی تھے۔ اس میں دلی دوستی بھی تھی، سماجی رشتوں کو بدل دینے کا عزم بھی تھا۔ نئی قسم کی شاعری سے دلچسپی بھی تھی اور اس

پنڈی میں ہمارے دوست ساحر اور سردار جعفری جیسے اپنی ہونہاری دکھا رہے تھے۔ لیکن ان سب چیزوں اور زجحانوں میں رومانیت کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اسی لئے فیض کی اس وقت کی شاعری ہماری ان تمام جذباتی کشمکشوں کی ترجمانی کرتی تھی اور دل میں اتر جاتی تھی۔ ہمارا کوئی بھی ساتھی یا دوست ایسا نہ ہوگا جس کو "نقش فریادی" یاد نہ ہو یا روزمرہ کے مشغلوں میں 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" کی بات نہ کرتا ہو۔

فیض کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی سادہ اور عام فہم زبان بھی تھی۔ اسی زمانے میں Caudwell کی کتاب "اسٹڈی ان ڈائنگ کلچر" شائع ہوئی۔ اس کا جملہ لفظاً آج بھی یاد آتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ شاعری ایک رومان بھی ہے کیونکہ اس کا رشتہ زبان اور سماج سے ہے اس لئے ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات فیض نے اپنے ڈھنگ سے پیش کردی ہے۔

اسی زمانے میں جان لری مرّی کی سوانح حیات New testament کا بھی چرچا چلا اور اس نے بائیں بازو کے دانشوروں میں ایک Negative قسم کی ہلچل پیدا کردی۔

Freeman ایک منحرف کیمونسٹ تھے۔ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے متعلق رائے میں شدید اختلاف تھا۔ لیکن ان کی زندگی کا ایک واقعہ بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا تھا۔ اپنے یونیورسٹی کے دنوں میں ان کی ملاقات ایک خوبصورت لڑکی سے ہوئی جس نے ان سے ایک دن پوچھا کالج چھوڑنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟ "شاعری اور انقلاب۔" لڑکی کو یہ خیال بڑا خوبصورت نظر آیا لیکن اس نے بہتر یہی سمجھا کہ ابھرتی محبت کو چھوڑ کر کسی خوشحال نوجوان سے شادی کرلی جائے۔ فیض بھی تو شاعری اور انقلاب کو اپنا چکے تھے لیکن ان کی قسمت فری مین سے بہتر تھی۔ یہ خبر کہ فیض ایک انگریز عورت سے شادی کررہے ہیں اور وہ بھی انگلستان گئے بنا بڑی عجیب لگی لیکن اس میں بھی فیض کا اپنا انوکھا پن تھا۔ ایلس اپنی بہن مسز تاثیر سے ملنے امرتسر آئی ہوئی تھیں کہ فیض سے ملاقات ہوگئی۔ ہم خیالی نے پیار کے رشتے کو مضبوط و مستحکم کردیا۔ جس زمانے میں فیض لاہور آئے اُس وقت تاثیر سری نگر میں پرنسپل ہوکر چلے گئے اس لئے شادی وہاں رچائی گئی اور نکاح شیخ عبداللہ مرحوم نے پڑھوایا۔ بعد کے سالوں میں شیخ صاحب اس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ شادی میں کشمیر نیشنل فرنٹ کے تمام سرکردہ ممبر شامل ہوئے تھے۔ صادق صاحب اور بخشی غلام محمد کے ساتھ فیض کی دوستی اسی وقت شروع ہوئی۔ فیض کو قدرت نے بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا۔ لیکن ایلس جیسی رفیقہ حیات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جس ڈھنگ اور بانکپن سے بیگم فیض نے مشکل کے دن کاٹے ہیں وہ ان کی قابل رشک ہمت کا ثبوت ہیں۔ فیض کی جنگ میں شمولیت سے بائیں بازو کے فن کار اور سوچنے والے یہ محسوس کرنے لگ گئے تھے کہ پہلی بات نازی بربریت کو ہرانے کی ہے اور جنگ کی فتح کے پس منظر میں کوئی انقلابی اور ترقی پسند طاقت اس

اصلیت کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ یہ سوچ فیض اور مظہر علی جیسے حساس لوگوں کو فوج میں لے گئی اور فیض کالج کی نوکری چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ میں کالج ختم کرکے کراچی چلا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے لئے دہلی آیا۔ اس زمانے میں نئی دہلی بھی کچھ اور تھی۔ رات کو "بلیک آؤٹ" ہوتا تھا۔ اور انڈیا گیٹ کے اس طرف تو تھا ہی جنگل۔ فیض صاحب کو گھر ملا تھا اورنگ زیب اسٹریٹ میں۔ رات میں ان کے ساتھ کھانا تو میں نے کھا لیا لیکن تانگے پر وہاں پہنچتے پہنچتے پسینہ نکل گیا۔ اب فیض صاحب کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ یا تو مجھے اپنی بوسیدہ آسٹن گاڑی میں واپس پہنچائیں یا رات کے قیام کا انتظام کریں۔

پھر تو پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ وطن بدر ہوکر دہلی آگئے۔ فیض واپس لاہور چلے گئے۔ کچھ برسوں تک رشتے معطل ہوگئے۔ اب فیض کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ میاں افتخار الدین نے پاکستان ٹائمز اور امروز کا اجرا کیا۔ فیض اور مظہر علی اس کے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہاں ہم لوگ یہ خبریں کر ان پر رشک کرنے لگے۔ یہاں تو دن رات مکانوں کی الاٹمنٹ اور راشن کارڈوں کی گردش میں کٹتے تھے۔ اور وہ نئے ملک میں نئی قدروں کے رجحان بنا رہے تھے۔ لیکن نہ ہی ان کی وہ حالت بہت دنوں رہی اور نہ اپنی۔ ایوب خان کا راج آیا تو پاکستان ٹائمز اور امروز کو سرکار نے دبوچ لیا اور اب بھی وہ سرکاری ٹرسٹ کی ملکیت میں ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد راولپنڈی سازش کیس کا ڈرامہ رچایا گیا۔ فیض اور سجاد ظہیر لمبے عرصے کے لئے جیل میں بند ہوگئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد میاں افتخار الدین انتقال فرما گئے۔

وہ اپنے وقت میں بڑے ٹھاٹھ کے انسان تھے۔ آکسفورڈ میں پڑھتے پڑھتے انقلابی بن گئے۔ واپس آنے کے بعد پنجاب کانگریس کے صدر جواہر لال جی کے ساتھ ان کا نہایت قریبی رشتہ تھا۔ میرے والد اور وہ جیل میں ہوا کھاتے ہوئے تھے۔ ان کا رشتہ فیض محمود علی مظہر علی اور ہم جیسے Leftist لوگوں کے ساتھ بہت گہرا تھا۔ فیض کو ان کی موت کا بہت رنج ہوا اور جیل سے انہوں نے ایک دردناک مرثیہ لکھا۔

کرو کج جبیں پہ سر کفن

مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو

کہ غرور عشق کا بانکپن

پس مرگ ہم نے بھلا دیا

جب ہم لوگوں نے یہاں اس شعر کو سنا تو ہندوستان کی سیاست ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ کانگریس دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ جس دن اندرا جی کو کانگریس سے نکال دیا گیا تو میں نے اُن کو یہی شعر لکھ کر بھیج دیا۔ ان کو بہت بھایا۔ گو اُن کو شعر یاد کرنے کی عادت تو نہ تھی۔ پھر بھی کئی دفعہ کہہ دیتی تھیں۔ "کیا تھا وہ فیض کا شعر"

فیض کا رشتہ پنڈت جی اور اندرا جی سے بہت قریب کا تھا۔ ۱۹۵۲ء

میں جب فیض دہلی آئے تو پنڈت جی نے پوری شام ان کے ساتھ گزاری تھی۔ ۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان میں حالات نے پلٹا کھایا۔ بھٹو کے دور میں فیض نیشنل آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر بنے تو دہلی آئے۔ میں اُن دنوں انفارمیشن براڈ کاسٹنگ کا منسٹر تھا۔ کہنے لگے "دو کام کرو ایک تو شیلا بھاٹیہ کا مقبول آپیرا Opera "ہیر رانجھا" اور دوسرے اپنے بھائی ستیش گجرال کی تصویروں کی نمائش پاکستان بھجوائیے۔ میں نے کہا کہ ہوگا تو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہماری بھی ایک شرط ہے کہ آپ دہلی ٹی وی پر اپنا پورا پروگرام کر دیں۔ فیض صاحب نے تو اپنی بات پوری کر دی لیکن نہ ہی شیلا بھاٹیہ کا آپیرا اور نہ ہی ستیش گجرال پاکستان جا پائے۔ ابھی تعلقات ہی کچھ ایسے تھے اور دن بدن بھٹو کے اطوار بدل رہے تھے۔ فیض اس سے مایوس ہو رہے تھے لیکن کوشش میں تھے کہ بھٹو اور ان کے مصاحب سامنے آنے والے دنوں کو دیکھیں۔ فیض اُن لوگوں میں تھے جو محسوس کرتے تھے کہ بھٹو اپنی غلطیوں سے صرف فوجی راج ہی کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ لیکن ہو کر ہی رہا۔ لیکن ہمارے ہاں بھی تاریخ ایک سخت موڑ لے کر ایمرجنسی لے آئی۔ فیض نے سوچا کہ شاید ایمرجنسی صرف بائیں بازو کو توڑنے کے لئے لائی گئی ہے لیکن وہ جلد ہی اس کے تیور سمجھنے لگے۔ جب ملے فیض نے کہا یہ تم نے خوب کیا۔ پاکستان کو جمہوری راہ پر لانے کے بجائے تم لوگ ہی ڈھلک گئے۔

جنرل ضیا کا زمانہ آیا تو پھر سے دل میں گھٹن اور دانشوروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ فیض تو کسی طرح نکل کر ماسکو آ گئے لیکن ایلس اور بچوں کو بہت دیر تک مشکلوں سے گزرنا پڑا۔ تب تک ایمرجنسی کے دور نے مجھے بھی ماسکو دھکیل دیا تھا۔ فیض جب ملے تو انہوں نے کہا۔

"ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا" اور ان کی نظم "میرے دل میرے مسافر" تو بس دل میں ہی اتر گئی۔ ہم کو تو ان کی وطن بدری کا بہت فائدہ ہوا۔ ہندوستان کا سفارتخانہ ان کا دوسرا گھر تھا اور شام کو ہمارے ہاں آ جایا کرتے تھے۔ ایک دن پرانی باتیں نکل کی نظم "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" آزادی کی جدوجہد میں اس نے مجاہدوں کی صفوں کو گرما دیا تھا۔ تب فیض نے بتایا کہ اس زمین پر انہوں نے بھی ایک نظم کہی ہے۔

سرفروشی کے انداز بدلے گئے
دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا
فیض کیا بات ہے کس آس پہ
منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پہ ہوا محتسب مہرباں
دل فگاروں پہ قاتل کو پیار آ گیا

اب تو کئی دفعہ شام کو جب شعر و شاعری کی محفل جمتی تو پاکستان اور بنگلہ دیش کے ڈپلومیٹ بھی آ کر نوازتے۔ بھارت میں موجود پاکستان کے سفیر ڈاکٹر ہمایوں خان سے بھی اسی دور میں ملاقات ہوئی۔ فیض کی اُردو زبان کو ایک دین یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو بین الاقوامی زبان بنا دیا۔ روس میں ان کے بہت سے مداح تھے جن کو فیض کی شاعری نے زندگی کا ایک اور ہی رُخ دکھایا ہے۔ ایک واقعہ اور ہماری ہندی بھاشا کے چوٹی کے کوی "بچن جی" ماسکو آئے۔

شام کو باقاعدہ مشاعرہ ہوا۔ بڑی رات تک بچن جی نئی اور پرانی کویتائیں سناتے رہے۔ فیض اپنی باری بھی خوبصورتی سے نبھاتے رہے۔ اس دن کا ایک شعر آج بھی دماغ میں گھومتا ہے۔

سہل یوں راہِ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے
ہم نے دل میں سجا لئے گلشن
جب بہاروں نے بے رخی کی ہے
زہر سے دھو لئے ہیں ہونٹ اپنے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے

فیض کے ماسکو کے قیام کے دوران میں ہی ان کو عالمگیر میگزین لوٹس Lotous کی ایڈیٹری سونپی گئی اس لئے ان کو نیا دور صرف بیروت میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ اسی اثناء میں ایلس بھی آ گئیں۔ بیروت کی غارت گری کا فیض کی شاعری پر گہرا اثر پڑا۔

چاند پھر آج بھی نہیں نکلا
کتنی حسرت تھی اُن کے آنے کی

یہ جاننا مشکل ہے کہ فیض چپکے سے مر گئے ہوں گے۔ یقیناً انہوں نے فرشتۂ اجل سے بھی پوچھا ہوگا۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

لیکن بات ختم کرنے سے پہلے ایک واقعہ کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ فیض کی شاعری کو اور سوچ کو نیا موڑ دینے میں محمود ظفر اور رشید جہاں کا بہت ہاتھ تھا۔ اسی دور نے ان کو کوئے یار سے نکل کر کوئے دار کا راستہ سمجھایا تھا۔ میں بھی ماسکو گیا ہی تھا کہ فیض کا پیغام ملا "رشید جہاں کی قبر پر میری طرف سے بھی پھول چڑھا دینا۔" دسمبر کی برفیلی سردی میں ہم دونوں میاں بیوی نے ان کی قبر ڈھونڈ نکالی اور وہاں پہنچے کہ فیض صاحب اور رشید جہاں یادگاری کمی کی طرف سے ہم نے قبر پہ کے پھول چڑھا دئے۔

فیض شاعر تو تھے ہی لیکن ایک پیارے دوست اور خوبصورت انسان تھے۔ یہ خلا کبھی پورا نہ ہوگا۔

بالمشافہ

کسی بھی کامیاب و کامران شخص کی بابت کلمات بتحسین ضابطۂ تحریر میں لانا مشکل کام نہیں ہوتا البتہ! جہاں کار ہائے نمایاں کی طویل زنجیر روبرو ہو تو الفاظ میں نظم و ضبط اور جذبات میں توازن قائم رکھنا مشکل تر ہو جاتا ہے۔ محترم اندر کمار گجرال کی شخصیت' کارنامے اور فتوحات اس قدر بامعنیٰ اور وسعت کی حامل ہیں کہ اُن کے عوض دل و دماغ کی باہم یکجائی بھی حق بہ حقدار ادا کرنے سے معذور ہیں۔ زیرِ نظر انٹرویو مارچ ۲۰۰۰ء سفرِ دہلی کے دوران ڈاکٹر کیول دھیر صاحب اور پروفیسر سردار مہندر سنگھ چیمہ صاحب کی ہمراہی میں کیا گیا تھا۔ اس نشست میں محترم گجرال صاحب کی شفقت' محبت' دانش اور ایثار نے اس قدر متاثر کیا کہ چہار سُو کے چند ناچیز اوراق گجرال صاحب کی قلمی اور قلبی شیفتگی کی نذر کر کے ایلیانِ اُردو ادب کو باخبر اور باثر اد کرنے کی خواہش دل میں موجزن ہوئی چنانچہ اس کاوشِ ناتمام کو ایک نیاز مند کا تحفۂ قلب جان کر قبول کیجئے!!!

گلزار جاوید

☆ آپ کی پیدائش کب' کہاں' کس ماحول میں ہوئی؟

☆☆ جناب! میں 4 دسمبر 1919ء کو آپ کے ہمارے محبوب سید ضمیر جعفری کے شہر جہلم کی سول لائن میں مسٹر K.S مہتن کی "مہتی بلڈنگ" میں پیدا ہوا تھا۔ ازاں بعد یہ بلڈنگ بخشی صاحب نے خرید لی تو یہ بخشی بلڈنگ کہلانے لگی۔ اس بلڈنگ میں چھ سات سال کی عمر تک رہے اس کے بعد کمبن وال کپور کے گھر میں بطور کرایہ دار منتقل ہو گئے۔ ابھی سکول ہی میں تھا تو والد صاحب نے دریا کے کنارے اپنا مکان خرید لیا تھا۔ میری چھوٹی بہن تارا ری تھی کہ اس مکان کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے البتہ! بخشی بلڈنگ جہلم کے آخری وزٹ تک موجود تھی۔

☆ والد صاحب کے مشاغل اور مصروفیات کیا تھیں اور ان کے آپ کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

☆☆ پیشے کے اعتبار سے والد صاحب وکیل تھے اُن کا شمار شہر کے اچھے وکلا میں ہوتا تھا۔ جس وقت برصغیر میں جنگ آزادی کی لہر چلی تو والد صاحب نے سرگرمی سے اُس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اسی دوران قید و بند سے بھی انھیں دوچار ہونا پڑا۔ میری سوچ اور مجھ پر والد صاحب کے بہت اثرات ہیں۔ آزادی سے قبل ہونے والے الیکشن میں والد صاحب اسمبلی کے ممبر بھی چنے گئے تھے اور انہوں نے کراچی میں منعقد ہونے والا اسمبلی کا پہلا اجلاس بھی اٹینڈ کیا تھا۔

☆ آپ نے کن حالات میں تعلیم حاصل کی اور آپ کے پسندیدہ مضامین کیا تھے؟

☆☆ میونسپل پرائمری سکول میں ایک سال پڑھنے کے بعد ماسٹر دیوان چند کے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ کل دو کمروں پر مشتمل اس گھر میں چار جماعتیں بھی لگتی تھیں اور دیوان صاحب کا گھر بھی چلتا تھا البتہ ڈانٹ وغیرہ کا قطعی تکلف نہ تھا۔ میں نے بعد میں اپنے بچوں کو وہ سکول دکھلایا ہے۔ پانچ یں جماعت کے بعد گورنمنٹ سکول جہلم میں چلے گئے جو کالا گوجراں کے پاس واقع ہے۔ دسویں پاس کرنے تک ملک کے حالات میں مزید بے چینی آ گئی تھی۔ ہماری طبیعت پر بھی اثر ہو رہا تھا جس کا اظہار ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلے کے بعد نمایاں ہونے لگا تھا۔ ایف ایس سی کے بعد پہلے کالج آف کامرس سے بی کام کرنے کے بعد پڑھائی کے ساتھ جنگ آزادی میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا جس کے سبب جیل جانا پڑا۔ ایک وقت ہمارے خاندان پر ایسا بھی آیا کہ والدہ صاحبہ' والد صاحب اور میں ایک ہی وقت میں الگ الگ جیلوں میں قید تھے۔ جب میں رہا ہوا تو ایم اے کا امتحان ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر لوکس نے مجھ سے دریافت کیا کہ امتحان دینے کا ارادہ ہے؟ میں نے لیکچر شارٹ ہونے کا عذر پیش کیا تو انہوں نے مذکورہ لیکچر پورے کئے۔ اس وقت ہیلے کالج لاہور کے پرنسپل جے۔ ڈبلیو۔ تھامسن تھے دوسرے کمرے میں کمیونسٹ پارٹی کا انڈر گراؤنڈ لٹریچر موجود تھا۔ پولیس چھاپہ مار کرائے برآمد کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح میرا سال ضائع ہونے کا اندیشہ تھا البتہ میرے تعلیمی کیریئر کے پیشِ نظر پروفیسر جے۔ ڈبلیو تھامسن نے پولیس کو میرے کمرے کی تلاشی لینے کی اجازت نہ دی۔

☆ لیکچر کی کمی ڈاکٹر لوکس نے پوری کر دی مطالعہ کا خسارہ کس طرح دور ہوا؟

☆☆ یہ بھی دلچسپی کی بات ہے کہ میری بیگم شریمتی شیلا گجرال ایم اے میں میری ہم جماعت تھیں۔ انھیں کے نوٹس پڑھ کر میں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔

☆ کالج کے دنوں کے اساتذہ اور ہم جماعتوں کی بابت کچھ بتایئے؟

☆☆ ڈاکٹر لوکس اور پروفیسر تھامسن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ انھیں دنوں فیض احمد فیض صاحب لیکچرر مقرر ہو کر آئے تھے۔ کمیونسٹ خیالات کی مماثلت کے باعث آخری دم تک فیض صاحب سے دوستی کا رشتہ قائم رہا۔ ویسے بھی میں اُن دنوں لاہور سٹوڈنٹ یونین کا صدر تھا جو کہ اس زمانے میں بڑی بات تھی۔ لہٰذا خورشید محمود جو ڈاکٹر کچلو کے داماد ہے وہ چونکہ لاہور میں رہتے تھے جبکہ رہنے والے مری اور راولپنڈی کے تھے۔ اس کے علاوہ مظہر علی خان پنجاب سٹوڈنٹ یونین کے صدر تھے۔ میاں افتخار الدین میرے دوست تھے۔ اُن کا گھر نوجوانوں کی سرگرمی کا بڑا مرکز تھا۔ رحمٰن صاحب یونین راشٹ والے اور عبداللہ ملک کی یاد بھی بہت آتی ہے۔ اس کے علاوہ ترقی پسندی کے حامل بہت سے ادبا اور شعراء سے بھی گہری دوستی تھی۔ احمد علی سردار جعفری صاحب، کرشن چندر صاحب اور سجاد ظہیر صاحب اور بھی کئی لوگوں کے چہرے نگاہوں میں ہیں نام البتہ یاد نہیں آ رہے۔

☆ آپ کی شخصیت پر کس کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں؟

☆☆ آپ کے اس سوال کے جواب میں ایک ہی نام لوں گا جے۔ ڈبلو تھامسن کا میری شخصیت اور زندگی پر ان کا بڑا اثر ہے۔

☆ سیاست میں داخلہ کب اور کیونکر ہوا اور آپ کا سیاسی گرو کون ہے؟

☆☆ جنگ آزادی میں حصہ لیتے ہی میری سیاسی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں تک سوال سیاسی گرو کا ہے تو سیاست میں میرا کوئی باقاعدہ گرو نہیں البتہ! آئیڈیل ضرور ہے اور وہ آئیڈیل جواہر لال نہرو ہیں۔ کیونکہ بطور مفکر اور ایتھیکل مہاتما گاندھی بہت بڑے تھے لہٰذا میری پیڑھی کے لوگ نہرو صاحب کے بہت قریب تھے۔

☆ تقسیم ہند آپ کے خیال میں مذہب، سیاست، معاشیات کس کے باعث ناگزیر ہوئی؟

☆☆ میں اسے دونوں طرف کے عوام کی بدقسمتی سے تعبیر کرتا ہوں۔ چونکہ ہم تاریخ کا رُخ نہیں موڑ سکتے اس لئے اُس کے فیصلوں کو بدلنے کا بھی ہمیں اختیار نہیں ہے۔ اگر تقسیم ہو گئی ہے تو اسے برقرار رہنا چاہئے۔ میں دو قومی نظریہ نہیں مانتا ہو گا نظریہ ضرور تسلیم کرتا ہوں۔

☆ تقسیم ہند نے خطے کے عوام پر آپ کے خیال میں کس طرح کے اثرات مرتب کئے نیز مستقبل میں یہ حالات کیا رُخ اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ بڑی اُلٹی بات ہے ایک سے دو، دو سے تین ملک بن چکے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور خطے کے تمام ملک چاہے باہمی سے رہیں۔ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی شناخت کا حصہ ہیں۔ پاکستان کے مسلمان اپنے شیرازے کے نگہبان ہیں۔ ہمارے درمیان مشترکہ تاریخ جیسی وراثت ہے جس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔

☆ آپ کے خیال میں تقسیم ہند کے باعث "اردو زبان" فائدے میں رہی یا خسارے میں؟

☆☆ فائدہ اور نقصان زبانوں کو نہیں لوگوں کو ہوا کرتا ہے۔

"STUDY IN DYING CULTURE"

میں کارڈویل نے دو تین باتیں بڑی دلچسپ لکھی تھیں۔ شاعری زبان میں ہوتی ہے چونکہ زبانیں لوگ بولتے ہیں اس لئے یہ کتاب لوگوں سے متعلق ہے خطے کے لوگ سماجی بندھن میں بندھے ہوئے ہیں اس لئے کسی زبان کی بابت بات کرتے ہوئے اُس خطے کے لوگوں کی ثقافت اور تاریخ کو مدنظر رکھنا ہو گا جو ہماری مشترکہ میراث ہے۔ اس کو بولنے والوں نے دونوں ملکوں میں اعزازی جگہ لی ہے۔ ہندوستان میں اردو کے ساتھ اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد آگے آ رہی ہے۔

☆ ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

☆☆ جیسا مستقبل ہندوستان کا ہے ویسا ہی "اردو زبان" کا ہے اگر اردو کا یہاں کوئی مستقبل نہیں ہے تو ہندوستان کا بھی کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ہر اردو بولنے والا مسلمان نہیں ہے اور ہر مسلمان اردو بولنے والا نہیں ہے۔ مثلاً تامل ناڈو، کیرالا، بنگال والے اردو داں نہیں ہیں جبکہ وہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی بستی ہے۔ اُردو بطور ذریعہ تعلیم بہت آگے بڑھ رہی ہے۔ حیدرآباد کی مولانا آزاد یونیورسٹی کا میں چانسلر ہوں اس میں پچاس ہزار طلبا ہیں۔ تمام کے تمام جدید علوم وہاں اردو میں پڑھائے جا رہے ہیں۔ ساؤتھ میں کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جہاں اردو نہ پڑھائی جاتی ہو۔ جب میں وزیر اطلاعات تھا تو اُس وقت "کمیٹی برائے فروغ اُردو" کی سفارشات پر میں نے نئی پالیسی بنوائی تھی۔ اس لئے کہ یہ پورے خطے کے لوگوں کو مربوط رکھتا ہے میرے خیال میں اردو اب انٹرنیشنل زبان بن چکی ہے۔

☆ آپ کے خیال میں مسلمانوں کا ہندوستان میں پس ماندہ ہونے کے کیا اسباب ہیں؟

☆☆ کیونکہ ہندوستان کی اکثریت پس ماندہ ہے یہ ساؤتھ ایشیا کی بدقسمتی ہے کہ اس کے ہر ملک کی اکثریت پس ماندہ ہے۔ بیشک! مسلمانوں کو نارتھ انڈیا میں مشکلات کا سامنا ہے کیونکہ وہاں کے پڑھے لکھے مسلمان پاکستان چلے گئے تھے۔ ابھی بھی ہندوستان کا امیر ترین آدمی ایک مسلمان "پریم جی"

ہیں۔ ہندوستان کی تین بڑی دولتی کمپنیوں میں سے ایک کا مالک مسلمان ہے
دلی میں صرف دو یونیورسٹیاں جامعہ ملیا اور ہمدرد مسلمانوں کے لئے وقف ہیں۔
ہندوستان کے صدور میں تین مسلمان گذرے ہیں۔ جو سب کے سب اپنی
لیاقت اور ذہانت کے بل پر اس اعلیٰ مقام تک پہنچے تھے۔

☆ ہندوستانی جمہوریت کا تجزیہ آپ کس طرح کریں گے؟ پچاس سال سے اوپر گزرنے کے باوجود آپ کے ہاں سیکولرازم پنپ سکا ہے نہ سیاسی قیادت پختہ اور شفاف ہوسکی ہے

☆☆ سیکولرازم ہندوستان میں بہت کامیاب ہے۔ سیکولرازم نہ ہوتا تو جناب گیانی ذیل سنگھ کس طرح صدر جمہوریہ بنتے؟ آرمی کا چیف سکھ کیسے ہوتا؟ ائر چیف مارشل ارجن سنگھ کیسے ہوتے؟ میں جب وزیراعظم بنا تھا تب میں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ میں ایک مہاجر ہوں جو صاحب حیثیت بھی نہیں پھر بھی آپ نے مجھے پردھان منتری چن لیا؟ تو گجرال جاوید صاحب! میرا یہی استدلال آپ کے سوال کا جواب ہے البتہ آپ مجھے یہ بتائیے! کہ آپ کے ہاں لیاقت علی خان کے بعد اب تک کیوں کوئی مہاجر وزیراعظم نہیں بن سکا؟

☆ بھارت میں انتہا پسندی کا جن جس تیزی سے بوتل سے باہر آرہا ہے اس سے بھارت کا مستقبل کس طرح کے خدشات میں گرفتار ہورہا ہے؟

☆☆ انتہا پسندی آج دنیا کے ہر ملک میں ہے۔ ایک انتہا پسندی معاشی غربت کے باعث ہے۔ اس کا علاج "زرعی اصلاحات" ہیں۔ دوسری انتہا پسندی مذہب کے نام پر ہے۔ اس کا حل جمہوریت ہے۔ ہم نے کئی سال پنجاب میں سکھوں کی انتہا پسندی کا سامنا کیا مگر جمہوریت کے ذریعہ اُسے حل کیا۔ انتہا پسندی کا جواب Moderation رواداری Tolerant معاشی انصاف ہے نہ کہ کاؤنٹر انتہا پسندی۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ کسی طرح کی تعلیمی قید نہ ہونے کے باعث بھارت کا سیاسی نظام اور سیاسی قیادت زوال پذیر ہے

☆☆ ضروری نہیں کہ ڈگری والا ہر شخص قابل ہی ہو یا جسے کالج جانے کا موقع نہ ملے وہ جاہل ہی ہو؟ ILLITERACY ہمارے ملکوں کا بڑا مسئلہ ہے۔ جہاں جہاں جہالت ختم ہوئی ہے وہاں وہاں حالات میں سدھار آیا ہے آبادی پر کنٹرول سے بہت سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی اولین کوشش جہالت کا خاتمہ ہے۔ قریب قریب اس کوشش میں ہم کامیاب ہو رہے ہیں۔ خاص کر پڑھی لکھی عورت کا ماں، بہن بیٹی ہونا کسی بھی مہذب معاشرے کے لئے انتہائی ضروری ہے

☆ آزادی کے اتنا عرصہ بعد بھی آپ کے ہاں اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کی دیواریں اس قدر مضبوط کیوں ہیں؟

☆☆ یہ کام جادو کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ ایک حد تک ہم کامیاب ہیں اور ایک حد تک ناکام بھی ہیں مگر ہماری کوششیں جاری ہیں۔ دیر البتہ! ضرور ہوئی ہے ناکامی ہرگز نہیں ہوئی۔ ہم اس سوال کو اپنے لئے باعث شرم تصور کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم اس لعنت سے بہت جلد آزادی حاصل کرلیں گے

☆ آپ کا کلچر جس بے ڈھنگی سے مغرب کی بھونڈی تقلید کر رہا ہے اس سے آنے والی نسلوں کا رنگ روپ بگڑ نہیں جائے گا؟

☆☆ کلچر کسی ملک کی جاگیر نہیں ہوا کرتا یہ Dynamic ہوتا ہے Static نہیں ہوتا۔ کلچر ہمیشہ دنیا کے ساتھ رشتہ قائم رکھتا ہے۔ اگر ہوائی جہاز مغرب کی تقلید میں چلایا جائے تو اُسے تقلید نہیں کہتے۔ جدید ہونا westernise ہونا نہیں ہے۔ وقت کے تقاضوں کے تحت پاجامے کی جگہ پتلون پہننا کہاں کی غلطی ہے؟ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

☆ مسئلہ کشمیر حل نہ ہونے کا ذمہ دار یا قصوروار کون ہے نیز اس مسئلہ کا بیرونی عوامل سے کس قدر تعلق جوڑا جا سکتا ہے؟

☆☆ بھارت اور پاکستان کے درمیان مسئلہ کشمیر کی ذمہ داری کا رنج کے سر ہے۔ کسی ایک کو دوشی ٹھہرانا غلط ہے۔ فرق صرف سوچ کا ہے۔ ایک بات صاف ہے جو بھی حل ہوگا ہندوستان مذہب کی بنیاد پر ہرگز تقسیم نہیں ہوگا۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ انڈونیشیا کے بعد مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی ہندوستان میں ہے۔ ہم نے اُن کے لئے پریشانیاں پیدا کرنے کے بجائے آسانیاں مہیا کی ہیں۔ ہم پاکستان اور بنگلہ دیش سے دوستی اور بھائی چارہ چاہتے ہیں اور اسی جذبے کے تحت ہم نے بنگلہ دیش سے پانی کا دیرینہ مسئلہ حل کرلیا ہے۔ ساؤتھ ایشیا کا مستقبل سانجھا ہے۔ ہمیں یورپ سے سبق سیکھنا چاہئے۔ اکٹھے رہنے یا بیوپار و لین دین میں ہی سب کا بھلا ہے۔

☆ کیا دونوں اطراف کی بھاری بھرکم افواج کی موجودگی میں خطے کے عوام امن کا خواب دیکھ سکتے ہیں؟

☆☆ دو باتوں کا دھیان رکھیے! میں نہایت ادب سے عرض کروں کہ آپ کے ہاں فوج راج کرتی ہے جبکہ ہمارے یہاں فوج ایک ذریعہ ہے ملک کی نظریاتی وجغرافیائی سلامتی کا۔ ہمارے ملک کا جغرافیہ اور سرحدیں مختلف ہیں اس لئے سائز بھی اُس کے مطابق ہے مسلح افواج کا۔

☆ خطے کے عوام کی فلاح و بہبود کے حوالے سے "سارک" اچھا پلیٹ فارم ہے۔ بھارت کا برتاؤ دیگر ممالک سے "سپر پاور" کی طرز کے باعث مفید پیش رفت نہیں ہو پائی!

☆☆ ایک دوسرے کو گالی دینا بہت آسان ہے۔ سپر پاور بننا آسان نہیں ہے۔ نہ لفاظی سے سپر پاور بنا جا سکتا ہے۔ کیا امریکہ ایک دن میں اس مقام تک

پہنچا ہے۔ خوابوں اور خیالوں سے پرے۔ پا ہو تو نہیں بنا سکتے۔ اس کے لئے انہوں نے محنت کی ہے اور ہر ملک کو محنت کے بل پر ترقی کرنے کا حق ہے۔

☆ بابری مسجد کا تنازعہ کس جماعت اور لیڈر کا پیدا کردہ ہے؟ آپ کی اس نازک مسئلے کے بارے کیا رائے ہے؟

☆☆ میرے خیال میں بابری مسجد کا انہدام بھارت کے جمہوری ڈھانچے کو زک پہنچانے کی سب سے بڑی کوشش تھی۔ یہ واقعہ قابل افسوس اور قابل ملال ہے جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مہذب ملک اور قومیں مندر، مسجد یا گرجا نہیں گراتیں۔ انسانوں میں دوستی اور دشمنی فطری بات ہے۔ عمارات تو تہذیبی اثاثے ہوا کرتی ہیں۔ جن ممالک نے اپنے تہذیبی اثاثے قائم رکھے ان کا حشر آپ کے سامنے ہے۔ روس والوں کو احساس تھا مگر انہوں نے مذہبی عمارات کو ہرگز نہیں گرایا۔ کریملن کے اندر تمام Monastic اب تک قائم ہیں جو کہ اچھی علامت ہیں۔

☆ مسلم دنیا اور مغربی ممالک کے ٹکراؤ کے نتائج آپ کے خیال میں کیا رخ اختیار کریں گے اور بھارت ان سے کس طرح متاثر ہوتا نظر آ رہا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں اس Issue کو بے ڈھنگ سے پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے کہا تھا ”تہذیبیں کبھی نہیں ٹکراتیں وحشتیں اکثر ٹکراتی ہیں۔“

☆ اقوام متحدہ جیسے نمائشی اور جانبدار سفید ہاتھی کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ مہذب دنیا کا نظام چلانے کے لئے کسی بہتر طریق کار کو ضروری خیال نہیں کرتے؟

☆☆ میں اس کے حق میں ہوں۔ یہ دنیا کی ترقی کا ثبوت ہے کہ ہم ایک جگہ بیٹھ کر بات تو کر سکتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ یہ ادارہ اس قدر جمہوری نہیں ہے جس قدر اس اہم ادارے کو ہونا چاہئے۔ اس ادارے کو زیادہ Reformer ہونا چاہئے۔ زیادہ Democratic ہونا چاہئے۔ اس میں تمام چھوٹے ملکوں کو اپنی بات کہنے اور منوانے کا مناسب موقع ملنا چاہئے۔

☆ آپ نے بطور ایک شہری بطور سیاستدان بطور دانشور اپنے ملک کی جس قدر بھی خدمت کی، آپ اس سے مطمئن ہیں؟ نیز آپ اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ کس طرح کریں گے؟

☆☆ دنیا میں شاید ہی کوئی شخص آپ کو ایسا ملے جو اپنی زندگی سے مطمئن ہو! جب میں اپنی زندگی پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو اپنی خوش قسمتی پر فخر ہوتا ہے کہ میں ہندوستان کی آزادی کا ایک ادنیٰ سپاہی رہا ہوں اور آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام کا ادنیٰ خادم ہوں۔ بقول شاعر۔

کس کس کو ہے میسر وہ کام کرتے رہنا
اک سانس سے جینا اک سانس سے مرنا

☆ آج کل مصروفیات کا دائرہ کار کیا ہے؟

☆☆ اول مطالعہ، دوئم کئی علمی درسگاہوں خاص کر والدہ محترمہ کے نام سے منسوب بچوں کے لئے سب سے بڑی سائنس سٹی کی تعمیر اور تنظیم۔

☆ اپنے چاہنے والوں سے کوئی خطاب کرنا چاہیں گے؟

☆☆

اس محفلِ کیف و مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

دو شعر

بے کنتی خواہشات میں اُلجھا ہے آدمی
تکمیل ایک جنم میں ممکن ہے چند کی
ملتا ہے یوں بشر کو فقط رنج و بے دلی
بے آرزو نصیب ہو گا کیف دائمی

(درسوامی شواننند جی۔ انگریزی سے ترجمہ)

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

تین شعر

یہ رہزنی، یہ قتل، یہ ہر گام حادثے
اے گردشِ حیات کوئی کس طرح جیے
یہ درد کی ہوا کسی آندھی سے کم نہیں
بجھنے لگے ہیں شام سے امید کے دیے
اے عمر ادھر کو فرصت بہت ہے کم
ارمان رہ گئے ہیں جو دل میں نکال لے

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

قصۂ غم کی انتہا کر دوں
ہر طرف حشر سا بپا کر دوں
میرے دل میں جو قلزمِ غم ہے
اس سے تجھکو آشنا کر دوں

(تشنہ)

شاہاں بہ شاہاں می دہند

خواجہ حسن ثانی نظامی

تاریخ بنانا تاریخ لکھنے والوں کے بس کا روگ نہیں اور جو لوگ تاریخ بناتے ہیں اُن کو لکھنے کی فرصت اور مہلت کہاں؟ مگر ہمارے گجرال صاحب نے تاریخ بنانے اور تاریخ لکھنے کا چمتکار ایک ساتھ کر دکھایا ہے اور وہ بھی ایسے نکھار و ذاتی تحصیل کے ساتھ جیسے علامہ اقبال کی زبان میں کہہ رہے ہیں:

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

ڈائری اور روزنامچے مغل بادشاہ بھی لکھتے تھے یا لکھوایا کرتے تھے۔ ان روزنامچوں میں ذاتی اور ملکی سب طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ توزک بابری اور توزک جہانگیری کو کون نہیں جانتا؟ مگر سلطانِ جمہور کے اس دور میں ایک "سلطانِ جمہور" کی لکھی ہوئی اس "توزک گجرال" کی شان کچھ اور ہی ہے۔ اول تو یہ کہ گجرال صاحب کی تگ و تاز دہلی دربار اور ہندوستان کے کسی ایک حصے یا بہت بڑے حصے تک محدود نہیں رہی۔ ان کی سیاسی چوگان کا میدان تو ساری دنیا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا سارا کھیل ایک آدمی اور ایک فرد کا کھیل نہیں رہا ٹیموں کا کھیل رہا ہے۔ ساجھے کی کوشش، ساجھے کے فیصلے، ساجھے کی کامیابی اور ساجھے ہی کی ناکامی بھی!

"توزک گجرال" ان کی اپنی ٹیم اور مخالف ٹیم کے ہر ہر کھلاڑی کی توزک اور ڈائری بھی ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ گجرال صاحب کے چھوٹے بڑے مضامین جمہوریت (ڈیموکریسی) کے قیام، دوام اور نشوونما کی دلچسپ اور گہری تاریخ ہیں۔ یہ تاریخ انسانی تاریخ کے بڑے اور وسیع کینوس پر جمہوریت (ڈیموکریسی) کے نئے اور سب سے بڑے انسانی تجربے کو مجسم کر دکھاتی ہے۔ تصویر برش یا نوکِ قلم سے بنائی جاتی ہے۔ یہ فنکار صاحب کے نامی گرامی چھوٹے بھائی ستیش کمار گجرال صاحب مشہور مصور ہیں۔ بڑے بھائی نے الفاظ سے مصوری کر دکھائی۔

سیاسی داستانیں سیڑھیوں پر چھلانگیں مار کر چڑھنے چھلانگیں لگا کر اُترنے یا سیڑھی کھسکا دیے جانے یا ہٹا دیے جانے کی داستانیں عام طور پر ہوتی ہیں مگر گجرال صاحب کا قصہ کچھ مختلف لگتا ہے۔ انہوں نے نیچی اونچی اور بیچ کی غرض کہ کسی بھی سیڑھی کو اپنے ہاتھ اور قدموں سے محروم نہیں رکھا۔ ہر سیڑھی پر پاؤں دھرا، جما کر اتارا۔ سیاسی مناظر میں یہ منظر خاصا اچھا منظر ہے۔ گجرال صاحب مشیر اور صلاح کار بھی رہے، صاحبِ اختیار اور صاحبِ اقتدار بھی اور شاید کبھی کبھی مجبور بھی! ان تمام باتوں نے ان کو دنیا بھر سب طرف کی چیزوں سے باخبر رکھا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اس طرح کی کوئی سنائی بات نہیں ہے، جس کو عدالت بھی گواہی کے دوران نہیں مانتی۔ سب کچھ دیکھا بھالا اور برتا یا ہے۔ خدا ہمارے محکمۂ تعلیم کو ایسی کچھ نیک توفیق دے کہ وہ گجرال صاحب کے ان تاریخی اور یادگار مضامین کو سیاسیات اور تاریخ کے درس اور کورس میں شامل کر لے تو وہ زمانے جس کو گجرال صاحب نے خود ہی خالی...... چھوڑ دیا ہے ان کو بھر جانے کی فرمائش تو مصنف سے ضرور کی جائے گی مگر اضافے کی گنجائش ان کی کسی رپورٹ میں محسوس نہ کی جائے گی۔ البتہ بین السطور کا معاملہ دوسرا ہے۔ ضرورت اس کو جاننے کی بھی ہوتی ہے سو اس کے لئے گجرال صاحب ہی کے دوست اور ہم عصر ..... شہرت یافتہ صحافی جناب کلدیپ نیر موجود ہیں۔ گجرال صاحب کے کورے اکشر، اگر وہ واقعی کہیں بیچ بیچ میں موجود ہیں تو ان میں روشنائی نیر صاحب ہی بھر سکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ اس اہم کام سے غفلت نہیں برتیں گے۔ میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آج کی اس تقریب میں اس معزز ہستی کی موجودگی میں کچھ عرض کرنے کی اجازت محترم مجتبیٰ حسین صاحب کے ذریعے ملی ہے جو اُردو زبان اور گجرال صاحب دونوں کی جوہر شناسی ہے یعنی ہندوستان کے نامور نائب صدر فضیلت مآب جناب کرشن کانت صاحب کی خدمت میں کتاب پیش کی جا رہی ہے۔ گجرال صاحب کی بہ نفس نفیس موجودگی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخش رہی ہے۔ لوگ تصنیف اور صاحبِ تصنیف کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر میری گذارشات کی سچائی کو پرکھ سکتے ہیں۔

محترم گجرال صاحب پنجابی ہیں اور ہر پنجابی کی طرح صحت مند اور توانا جسم کے مالک اور خوش مزاج بھی ہیں۔ یہ چیز بھی ان کے جسم و دماغ کی صحت کی علامت ہے۔ غصہ ہمیشہ کمزور آدمی کو آتا ہے۔ گجرال صاحب کو یہ نیاز مند تو بہت غور سے دیکھتا رہا ہے لیکن ان کو کبھی غصے میں دیکھنے کا "شبھ اوسر" ہاتھ نہیں آیا۔ اگر اجازت پاؤں تو عرض کروں کہ پنجابی بھائی جتنی آسانی سے غصے کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اتنی آسانی سے اپنے "آن" اور "بل" پر قابو رکھنا شاید ان کے لئے مشکل ہوتا ہے مگر گجرال صاحب اس معاملے میں بھی طاق ہیں۔ انہوں نے اپنے کپڑے نہ کبھی ڈھیلے ہونے دیے اور نہ تنگ۔ سدا ایک وزن رکھا کہ جو ان کا ساتھ دے سکیں۔

گجرال صاحب کے روئے روشن کے درشن کیجئے تو نقوش تیکھے آرین رنگ شمالی ہندوستان کی اُجلی اور سوندھی روٹی کی طرح گندمی، ڈاڑھی پہلے نہیں تھی، اب کافی عرصے سے ہے مگر کی گھنی جوجھری۔ کہاوت ہے کہ "آدمی کھائے من بھاتا، پہنے جگ بھاتا" سو انہوں نے ڈاڑھی رکھنے میں بھی "جگ پسند" کو اپنی پسند رکھا۔ فرانس سے لے کر روس تک کسی کو ان کی داڑھی اچھی اور غیر نہیں لگی۔ پردیس کی اس بات کو چھوڑ کر ان میں ساری باتیں سر سے پیر تک دیسی اور خالص دیسی بالکل شدھ ہندوستانی ہیں۔ سراپا ان کو گر دواروں میں بارہا ملا ہوگا۔ کام ہی ان کے سارے خلعت پانے والے ہیں مگر یہ سراپا اور خلعت ان کو نہ بھی ملتے تو یہ ہندوستانی سراپا غیب سے لے کر پیدا ہوئے لگتے ہیں۔

گجرال صاحب کا ترقی پسند..... ہونا کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے مگر گھوڑ سواری کے وقت انہوں نے اپنے گھوڑے کی الٹی طرف کی راس اور لگام کو اتنے زور سے کبھی نہیں کھینچا اور کھینچے ہی نہیں رکھا کہ گھوڑا بے چارہ بس اپنے بائیں پہلو کی طرف ہی چکر کاٹتا رہا اور آگے نہ بڑھ سکے۔ انہوں نے داہنے شہسوار کی طرح دائیں طرف کی پوری خبر رکھی۔ یہ ہندوستانی مزاج نہیں تو اور پھر کیا ہے؟

گجرال صاحب ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سب کے ایسے دوست ہیں کہ دوستی دوستی سے بڑھ کر "یاری" تک پہنچ جاتی ہے۔ شاید اس یاراباشی نے ہی ان کی تحریر میں ایک عجیب طرح کی مزید دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ان کی تحریر آسان، عام فہم اور دل موہ لینے والی ہوتی ہے۔ الفاظ ہندی، اردو، پنجابی اور انگریزی بہت سی زبانوں کے اپنے اپنے مقام پر موجود ملتے ہیں۔ پنجاب کے سیاسی حالات کے بیان میں اُن کا یہ فقرہ پڑھ کر میں تو پھڑک گیا... "پچھے برس میں جب لونگووال، بادل اور توہڑہ جیل میں تھے تو باہر ان کی صفوں میں اڑی کھڑی تھی!"

"بادل" کے ساتھ "پچھے برس" کیا خوب کا استعمال۔ پھر "اڑی" کے ساتھ "کھڑی" کا جوڑ سبحان اللہ! حرف "ڑ" سے آواز اور صوت کے لحاظ سے کانوں کو بھلا نہیں لگتا مگر یہاں ڈھولک کے پنجابی گیت کی بھرپور تھاپ بن کر کان تک پہنچتا ہے۔

حضرات! رات تھوڑی اور داستان طولانی! آخر میں بس یہ اور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ آج کے نظارے کا کئی دن سے اشتیاق تھا کہ دیکھیں تاریخ کا ایک ٹکڑا سو برس پرانا بھولا بھلایا سین دوبارہ کس طرح نظر آتا ہے۔ مشہور ہے کہ ہندوستان کا ہمایوں بادشاہ ایران کے شاہ کا مہمان ہوا اور کھانا کھانے دونوں بادشاہ دسترخوان پر بیٹھے تو ہندوستانی بادشاہ کا ایک مصاحب مشکل میں پڑ گیا۔ اس کو کھانے کی کوئی ڈش پیش کرنی تھی۔ سوچنے لگا کہ اگر اپنے ہندوستان کے بادشاہ کے سامنے ڈش پہلے لے جاتا ہوں تو بال برابر ہی سہی مگر میزبان شاہ ایران کی اہمیت گھٹتی ہے اور ایران کے شاہ کی خدمت میں پہلے پیش کروں گا تو وہ بھی بال برابر ہی سہی اپنے بادشاہ کی اہمیت گھٹانے والی بات ہو جائے گی۔ آخر اسے یہ ترکیب سوجھی کہ ایک بادشاہ کے سامنے یہ کہتے ہوئے ڈش حاضر کی کہ... "شاہاں بہ شاہاں بہ دہند" یعنی بادشاہ کو کوئی بادشاہ ہی کچھ پیش کر سکتے بات ہے۔ آج بھی کچھ اسی طرح کا موقع آ گیا ہے۔ ہمارے محترم نائب صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں ادارہ اخبار "سیاست" حیدرآباد کی طرف سے چھپی ہوئی کتاب پیش کی جا رہی ہے جس کو خود "سیاست نامہ" کہا جائے اور جو چند دن قبل تک وزارت عظمیٰ کے عالی قدر عہدہ پر فائز رہے جناب اندر کمار گجرال کی تصنیف ہے۔ اردو صحافت کی دنیا میں اخبار "سیاست" کی تاجداری بھی مسلمہ ہے یعنی تینوں جانب چھا جانا ہی شاہی منظر ہے۔ سلطانی جمہور ہی کا سہی!

شاہاں بہ شاہاں می دہند!... مبارک باشد!

یوگی جی

(ماتا جی کی رحلت پر)

یوگی جی! بکھرنے لگ جائے جب جیون کا تانا بانا
دُکھیا مَن کو میت بنا کر اپنا مَن پرچانا

اُٹھ جائے جب سر سے سایۂ پیار بھرے ہاتھوں کا
بیٹھ کے یادوں کے جھرمٹ میں دل اپنا بہلانا

پھوٹیں جب نینوں سے تارے نو کے پیار کی گنگا
دیکھ کے مَن درپن میں مکھڑا، اپنا روگ مٹانا

تم بھی پتھر، میں بھی پتھر، پتھر کا جگ سارا
سنگ و خشت کی اِس بستی میں جیون ناد بجانا

تخیّلؔ تن جب رخصت مانگے اِس فانی دنیا سے
خود ہی اپنا نوحہ لکھنا، خود ہی اُس کو گانا

۱۴ نومبر ۱۹۹۹ء

موجودہ دور کے نہرو

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

اندرکمار گجرال ایک نام ہی نہیں ایک ادارہ اور ایک تحریک ہیں۔ آج جبکہ ایسی قوتیں سر اٹھا رہی ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کے ہر قدم کو الٹ دینا چاہتی ہیں۔ ایسے میں اندرکمار گجرال کی شخصیت ملک کو نہرو کے بتائے ہوئے راستے پر چلائے رکھنا چاہتی ہے۔

آج کے ہندوستان میں جبکہ کانگریس نے اپنی کل ہند شناخت اور حیثیت کھو دی ہے اور رجعت پسند قوتیں سر اٹھا رہی ہیں ملک ایک ملی جلی حکومتوں کے دور سے گزر رہا ہے۔ ملی جلی حکومتیں رجعت پسند ہو سکتی ہیں اور آگے کی طرف دیکھنے والی بھی۔

اندرکمار گجرال نے اس کولیشن کے راز کو جان لیا ہے اور اس کے اندر کو سمجھ لیا ہے۔ کولیشن کی رہنمائی کرنے کے لئے ایک نئی ذہنی ساخت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر صبر کی ضرورت ہوتی ہے تو رفقاء کی بات کو سمجھنے اور اس کے اچھے پہلوؤں کو اپنانے کی بھی صلاحیت ہونی چاہئے۔

اندرکمار گجرال کو کسی نے خفا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ اپنے مخاطب کی بات کو بیچ ہی سے کاٹ کر اپنی منوانے کی کوشش کبھی نہیں کرتے۔

گجرال نے ہندوستان کی خارجی پالیسی کو نہرو ہی کے ڈھالے ہوئے سانچے میں پروان چڑھایا انھوں نے ایسے بہت سے جھگڑوں کو سلجھایا جو ایک عرصے سے ہندوستان اور اس کے پڑوسیوں کے درمیان الجھاؤ کا باعث بنے ہوئے تھے۔ بنگلہ دیش کے پانی کا سوال، نیپال سے بعض حل طلب مسائل کا حل اور پھر سارک ملکوں کے درمیان تعاون کو فروغ دینے اور اس نئی مارکیٹ کو فروغ دینے کے سوال پر انھیں نے اہم قدم اٹھائے۔

فن کی سنجیدگی کو صرف ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ایک بین الاقوامی فورم میں پاکستان کے نواز شریف صاحب سے گجرال کا سامنا تھا۔ نواز شریف نے کچھ نزاعی مسائل چھیڑ دیے اور تلخی گسترانہ بات کہہ دی۔ گجرال اگر اس چال میں پھنس جاتے اور جواب دیتے تو حالات بگڑ سکتے تھے۔ لیکن گجرال نے اس موضوع کو چھیڑا تک نہیں اور نواز شریف کی چال کامیاب نہ ہو سکی۔

غرض یہ محض ایک مثال تھی۔ گجرال نے اقوام عالم سے تعلقات میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کر دیا ہے اور یہ ہے صبر و تحمل کا، نرم لہجے کا، اور بات چیت سے کٹھن سے کٹھن مسائل کا حل دریافت کرنے کا۔ اگر مسئلہ اتنا کٹھن ہے کہ فوری حل ممکن نہیں تو دوسرے مسائل حل کر لئے جائیں اور ایک ایسا خوشگوار ماحول تیار ہو جائے جس میں کٹھن مسائل بھی حل ہوتے نظر آئیں۔ ماحول بنانا بھی ایک آرٹ ہے جس پر گجرال کو پورا پورا عبور معلوم ہوتا ہے۔

اردو زبان کے تعلق سے تو گجرال کا کارنامہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

گجرال کمیٹی نے پہلے تو اردو کا صحیح تاریخی مقام بتایا اور اس فکر کو توڑا کہ اردو تقسیم ہند کی ذمہ دار ہے۔ اردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ وہ ہندوستان کی ایک زبان ہے اور آئین کے آٹھویں شیڈول میں اسے دوسری قومی زبانوں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ تقسیم ہند ایک سیاست کا نتیجہ تھی۔ اردو زبان کو قربانی کا بکرا کیوں بنایا جائے؟

گجرال کمیٹی کی رپورٹ نے اردو کے مقدمے کو جمہوری انداز میں پیش کیا ہے۔ قابل عمل تجویزیں پیش کی ہیں۔ اور پھر زبانوں کا سوال تعلیم کے میدان میں ہو کہ نظم و نسق کے میدان میں ریاستوں کا سوال ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ریاستوں میں ایسا جمہوری ماحول پیدا کیا جائے کہ وہ لسانی تعصبات سے پاک ہو اور زبانوں کے آپسی روابط کو فروغ دیا جائے۔

گجرال نے اس میدان میں بھی اپنے نظریے کی چھاپ بٹھا دی ہے اور اردو والوں کے ہاتھوں میں ایک ہتھیار دے دیا ہے۔

غرض گجرال نے اپنی شخصیت کو سماجی، لسانی، سیاسی ہر میدان میں منوا لیا ہے۔ ہندوستان کو اُن پر فخر ہے۔

کچھ لوگ ہیں خاموش

خشونت سنگھ

میں انھیں ۱۰ سال سے زائد عرصے سے جانتا ہوں جب وہ ایک طالب علم ہوتا تھے۔ کافی ہاؤس میں عادتاً اُن کا آنا جانا رہتا تھا۔ اس کے بعد وہ سیاست میں آگئے۔ انھیں سفیر بنایا گیا اور مرکزی حکومت میں وزارت کے عہدے پر متمکن ہوئے۔ ان باتوں کے علاوہ میں انھیں سب سے زیادہ مشہور مصور فنکار اور آرکیٹکٹ ستیش گجرال کے بڑے بھائی کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ چونکہ میں ان دنوں ستیش گجرال کی خودنوشت سوانح عمری کی تدوین میں مصروف ہوں جو اس سال کے آخر میں Penguins Viking ادارے کی جانب سے شائع ہونے والی ہے جس میں اندر کمار گجرال کے پس منظر اور تعلیم و تربیت کے اس ماحول سے بھی واقف ہوں جس نے ہمارے آج کے وزیراعظم کو تخلیق کیا۔

گجرال برادران کی زندگی پر غالب ترین اثرات اُن کے والدین یعنی اُن کے والد اوتار نرائن اور والدہ اندو کے تھے۔ شادی کے بعد جن کا نام پشپا رکھ دیا گیا تھا۔ اوتار نرائن جہلم میں ایک وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے تھے۔ وہ اپنے پیشے میں کامیاب تھے اور انھوں نے کچھ عرصے تک اپنے آپ کو ایک "گورا صاحب" بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ انگریزی لباس پہنتے تھے۔ اُن کے پاس دو گھوڑے تھے۔ وہ روزانہ صبح کو اپنے بیٹے اندر کمار کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر سول لائن جایا کرتے تھے جہاں رہنے والے "صاحب لوگ" صبح کی ہواخوری کے لئے گھوڑے استعمال کرتے تھے۔ پشپا بھی قمیص کے بجائے ساری پہننے لگیں اور بیڈمنٹن سیکھنے کے لئے جانا شروع کیا۔ اس کے بعد اوتار نرائن لالہ لاجپت رائے کے زیر اثر آگئے اور ایک پکے آریہ سماجی اور اس سے بھی زیادہ ایک "گاندھیائی" بن گئے۔ ایک دن زن و شوہر دونوں نے اپنے کپڑے جلا ڈالے۔ ولایتی کپڑوں کے بجائے دیسی کھادی کا لباس پہننا شروع کر دیا۔ یہ قلب ماہیت ہمہ جہتی انداز کی تھی۔ اوتار نرائن عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کرنے کے بجائے ہندوستان کی آزادی کے مقصد کی تشہیر میں زیادہ وقت صرف کرنے لگے۔ خاوند اور شوہر دونوں کئی مرتبہ جیل گئے۔ اندر کمار صرف دس سال کے تھے جب وہ پہلی دفعہ جیل گئے۔ جب پنڈت نہرو ایک موقع پر جہلم آئے تو انھوں نے اوتار نرائن کے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر ننھے ستیش گجرال کو اپنی گود میں لے کر تقریر کی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ لاہور میں طالب علم ہوتا اندر کمار گجرال کے بارے میں سنا تھا۔ کافی ہاؤس میں بھی اکثر و بیشتر ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ تقسیم وطن اور میرے بیرون ملک گزارے ہوئے برسوں کے دوران مجھے اُن کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ستیش گجرال کی خودنوشت سوانح حیات سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اور اُن کے والدین تقسیم کے بعد جہلم میں رہائش پذیر تھے۔ اوتار نرائن دستور ساز اسمبلی کے لئے منتخب ہو گئے تھے اور چونکہ وہ پاکستان میں تھے، جناح نے اُن کا انتخاب پاکستان کی پہلی کابینہ کے ہندو وزیر کی حیثیت سے کر لیا تھا۔ اُن کا قیام مستقل طور پر جہلم میں رہا اور وہ قریبی مواضعات سے اغوا شدہ ہندو اور سکھ عورتوں کی بازیابی میں مصروف رہے۔ پشپا نے ان عورتوں کو پناہ دی اور اس کے بعد اُن کی بازآبادکاری کے لئے ایک امدادی کمیٹی قائم کی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب اوتار نرائن بالآخر ستیش اور اپنے دیگر بچوں کے ہمراہ جہلم کو خیرباد کہہ دیا تو اُن کی دستور ساز اسمبلی کی رکنیت کو ہندوستان منتقل کر دیا گیا حالانکہ اُس وقت وہ قطعی قلاش ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی کو امدادی کمیٹی چلانے کے لئے مدد کے طور پر دہلی میں پارلیمنٹ کی طرف سے تحفہ اور مکان دیے جانے کی پیشکش کو نامنظور کر دیا اور اندر کمار گجرال کی دولت اور عیش و آرام سے نفرت اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے۔

انھوں نے ستیش کی جو آٹھ سال کی عمر میں قوت سماعت سے محروم ہو گئے نگہداشت کے لئے اپنے والد کی ذمہ داری خود سنبھال لی تھی۔ جتنے عرصے تک ستیش لاہور کے میو کالج آف آرٹس اور اس کے بعد بمبئی کے جے جے۔ کالج آف آرٹس میں زیر تعلیم رہے اندر کمار نے اُن کی سرپرستی کی۔ اس بات کی کہ ستیش کی قوت سماعت پوری طرح زائل ہو جانے کے بعد ان کی قوت گویائی میں کوئی فرق نہیں آیا، اصل بنیاد وہ توجہ اور محبت تھی جو اندر کمار نے اُن پر نچھاور کی تھی۔

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ اندر کمار اپنے چھوٹے بھائی ستیش کی وجہ سے نہرو خاندان کے قریب آئے تھے۔ میکسیکو سے واپس آنے کے بعد ستیش کی خدمات پارلیمنٹ ہاؤس کے لئے لالہ لاجپت رائے کی تصویر بنانے کے لئے حاصل کی گئیں۔ سلیکشن کمیٹی نے اُن کی بنائی ہوئی تصویر کو مسترد کر دیا تھا۔ پنڈت نہرو نے کمیٹی کے فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے اس کو پارلیمنٹ ہاؤس میں لگانے کی منظوری دے دی۔ حالانکہ پنڈت جی لالہ لاجپت رائے کو سرعام ایک ہندو فرقہ پرست کہتے ہوئے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اب ستیش سے (آنند بھون میں لگانے کے لئے) اپنی اور اپنی بیٹی اندرا کی ایک تصویر بنانے کی فرمائش کی۔ ان طویل نشستوں کے دوران اندر کمار اپنے سماعت سے محروم بھائی کے لئے ایک ترجمان کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ اندرا نے ان کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور دہلی کے امور ان کے سپرد کر دیے۔ ان کو پارلیمنٹ کا ممبر منتخب کرا لیا اور وزیر بنایا۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ

ملاقات کی تھی جب وہ مسز گاندھی کی حکومت میں اہم قلمدانوں کو سنبھال رہے تھے۔ اور ایک موقع پر جب مسز گاندھی اُن سے ناراض ہو گئیں تو انہیں سفیر بنا کر ماسکو بھیج دیا گیا۔ جب وہ اقتدار میں ہوتے تھے تو انتہائی نرم مزاج اور ہمدرد مہربان ہوا کرتے تھے۔ اور اقتدار سے ہٹنے کے بعد ان میں شعریت کی کمی نہیں ہوتی تھی۔

ایک موقع پر حکومت کے ایک زبردست تنقید کار کے اعزاز میں ہونے والی ایک تقریب کے دوران اندرکمار گجرال نے جو اس وقت حکومت کے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ (میرے خیال سے دشینت کمار کا) ایک شعر پڑھا۔

کچھ لوگ ہیں خاموش مگر سوچ رہے ہیں
سچ بولیں گے جب سچ کے ذرا دام بڑھیں گے

سیاست پوری طرح اندرکمار گجرال پر منطبق ہوتی ہے۔ وہ ڈر اور خوف سے واقف نہیں ہیں۔ وہ خود اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے کسی سکے کے سودونیاں کا موازنہ پیش کرتے۔ ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ بھوکے بھیڑیوں کے اس غول میں جو ہمارے آج کے سیاست دانوں نے بنا رکھا ہے، کب تک زندہ رہیں گے۔ وہ پنجابیوں کی زبان میں ''بیبا'' (ایک مٹھائی کا نام) یعنی ایک دلآویز شخصیت ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب تک وزیر اعظم رہیں گے۔ ہندوستان کے عوام نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ پنڈت نہرو اور شاستری کے بعد ہمیں وزیر اعظم کی حیثیت سے گجرال کی طرح کوئی بلند کردار، بدعنوانیوں اور خویش نوازی اور مذہبی تعصبات سے بالاتر اور صحیح الذہن انسان اب تک نہیں ملا ہے۔

میں نے رسم حلف برداری کو ٹی وی پر دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے صرف دوسرے درجے کے چند فرقہ ودی کابینہ میں رہ گئے ہیں۔ میں نے اُن وزراء کا بھی شمار کیا جنہوں نے خدا کے نام پر حلف لینے کی زحمت گوارا کی اور اُن لوگوں کا بھی جنہوں نے صرف قسم کھائی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ صرف قسم کھانے والوں کی تعداد خدا پرستوں سے بہت کم تھی۔ چندرا سوامیوں، تانترکوں، نجومیوں اور راہو کالاسوں کو ماننے والوں کے دن اب ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ نہرو کی طرح سیکولرزم کے سچے پرستاروں کے دن ایک بار پھر واپس آ جائیں گے۔ اس بات کا اظہار وزیر اعظم کی ترجیحی سرگرمیوں، اقتصادی پیداوار کی رفتار میں تیزی، کمزور طبقات کی فلاح و بہبود، سیکولرزم کے تحفظ، سائنسی مزاج کے فروغ، حقوق نسواں کے لئے کی جانے والی خدمات اور شرح آبادی میں اضافے کو روکنے کے اقدامات سے ہوتا ہے۔ وزیر اعظم زندہ باد۔

اک تبسّمِ گُل

پروفیسر گوپی چند نارنگ

جناب اندر کمار گجرال ہر چند کہ حکومتِ ہند میں وزارتوں اور سفارتوں کے سلسلے میں اونچے سے اونچے عہدوں پر رہے ہیں لیکن اُردو والوں کے دل میں اُن کی حیثیت ایک "اُردو والے" کی ہے اور یہ رشتہ اِتنا سچا اور بےلوث ہے کہ اونچی سے اونچی وزارت یا سفارت سے کسی کو عزت و احترام کا وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو اُردو والوں کی نظر میں گجرال صاحب کا اُردو کی محبت کے رشتے سے ہے۔ اُردو والوں کے لئے یہ کُل کی بات ہے کہ برسوں کی محنت اور تگ و دو اور سینکڑوں ہزاروں یادداشتوں کی جمع آوری کے بعد گجرال کمیٹی کی جو رپورٹ تیار ہوئی تھی اُس کی حیثیت زبان کی ترقی و بقا کے لئے ایک مستقل دستاویز کی سی ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست جس نشیب و فراز سے گزر رہی ہے اور جس طرح قدروں کے زوال کا منظر روز بروز عریاں ہوتا جاتا ہے اُس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کچھ باضمیر لوگوں نے اپنے وجود کو داؤ پر لگانا گوارا کیا لیکن ظلم و بےانصافی سے کسی قیمت پر سمجھوتا کرنا پسند نہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بڑے سے بڑے فولادی کرداروں کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا گیا لیکن گجرال صاحب کی ذات تھی کہ آفات و حوادث کی موجوں کو انہوں نے سر سے گزر جانے دیا اور ان کے پائے استقلال میں ذرا سی لغزش نہ آئی۔ گجرال صاحب کا تعلق پنجاب کے ایک ایسے خاندان سے رہا ہے جس کا نام قومی سیاست میں ہمیشہ ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کچھ خاندانی شرافت، کچھ اُردو کی روایت جو نو دولتیوں کو خاطر میں نہیں لاتی اور رواداری کے سوا کسی کی ترغیب دیتی ہے، کچھ فیض احمد فیض کی رفاقت و محبت جن سے گجرال صاحب کو والہانہ عقیدت رہی ہے۔ غالباً اِن سب عوامل نے مل کر گجرال صاحب کی سیرت میں کچھ ایسی ملائمت اور بلند ہمتی کا جوہر بھر دیا ہے کہ پچھلے تیس چالیس برسوں میں وہ سیاست دانوں کی بھیڑ میں ہر قدم پر دوسروں سے مختلف اور دوسروں سے کچھ الگ اور کچھ آگے رہے ہیں۔ سیاست میں تو ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں، کیسے کیسے ہمارے دیکھتے دیکھتے ایسے ویسے ہو گئے اور ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے۔ لوگ آتے ہیں وزیر وغیر بنتے ہیں اور جب کرسی سے اتر جاتے ہیں تو کوئی نام لیوا گوارا نہیں کرتا ہے۔ آئے دن یہ منظر دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ گجرال صاحب نہ تو نرے سیاست داں ہیں، نہ نرے وزیر، نرے سفیر۔ اُن کے دل میں انسانیت اور دردمندی کی جوت ہمیشہ روشن رہی ہے۔ فکر کی بلندی، سخن کی دلنوازی اور جاں کی پُرسوزی ہمیشہ اُن کا سرمایۂ حیات رہی ہے۔ وہ اُردو والوں کے دل میں رچے ہیں اور اُردو والے بھی اُن سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ آج جو ملک بھر میں اُردو اکادمیوں کی ریل پیل دکھائی دیتی ہے یہ سب گجرال صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ ایک پہلو ہے۔ ان بارہ تیرہ اکادمیوں کا کُل بجٹ ملا کر چھ سات کروڑ روپے سالانہ سے کم نہ ہوگا اگر اُن کی کارکردگی توقعات کے مطابق نہیں یا روپے کا صَرف ٹھیک سے نہیں ہوتا یا ترقیِ اُردو بیورو کو خود مختاری دی گئی ہے اور ہم اس خود مختاری کا فائدہ نہیں اٹھا پاتے تو قصور ہمارا ہے۔ قصور مراعات دینے یا مراعات دلانے والوں کا نہیں۔ گجرال صاحب کی حیثیت ایک باضمیر دانشور اور صاحبِ نظر صحافی کی بھی ہے۔ وہ حکومت کے اندر رہے ہوں یا باہر، اُردو کے مسائل پر اور دوسرے قومی، ملکی اور کلچرل مسائل پر ہندوستان اور پاکستان کے اخباروں میں وہ برابر لکھتے رہے ہیں۔ انگریزی کے علاوہ اُردو کو بھی انہوں نے ہمیشہ وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے مرحوم عابد علی خاں مدیر "سیاست" حیدرآباد کو جن کی رفاقت نے گجرال صاحب کو ہمیشہ مجبور کیا کہ وہ سیاست اخبار کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے رہے ہیں۔ ان برسوں میں گجرال صاحب کے بہت سے مضامین جو اصلاً انگریزی یا ہندوستانی میں لکھے گئے وہ روزنامہ "سیاست" میں ترجمہ ہو کر یا رسم الخط بدل کر اُردو کے قالب میں شائع ہوئے۔ مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ ادارۂ سیاست نے ان تحریروں کو یکجا کر کے "مضامینِ گجرال" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ ہر چند کہ اخباروں میں شائع ہونے والے مضامین ہنگامی نوعیت کے ہوتے ہیں اور صبح کو چھپتے ہیں تو شام کو کوئی پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتا لیکن گجرال صاحب کے مضامین اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے مستقل نوعیت رکھتے ہیں۔ ہند پاک دوستی گجرال صاحب کا خاص موضوع ہے۔ اِسی طرح افغانستان اور ہمارے مفادات اور کشمیر...... کے بعد لئے تو نیا سوویت یونین کا زوال آج بھی پڑھے جانے اور غور کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایک مضمون ہندوستان میں اُردو کے مسئلے پر ہے جس میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پر روشنی ڈالی ہے جن پر عمل درآمد ہونا باقی ہے۔ ایک مضمون فیض احمد فیض کی یاد میں ہے۔ اور گاندھی جی کی راج نیتی اور پنڈت نہرو اور صحافت بنیادی نوعیت کے مضامین ہیں۔ ایک بےحد دلچسپ مضمون ہے "میں اخبار کیوں پڑھتا ہوں"۔ گجرال صاحب کی زبان رواں دواں، صاف سادہ، سلیس اور شفاف ہے۔ خود گجرال صاحب کی شخصیت کی طرح۔ ادارۂ "سیاست" ہمارے شکریے کا مستحق ہے کہ دستاویزی اہمیت کی حامل اِس کتاب کو شائقینِ اُردو کے لئے فراہم کر دیا۔ جہاں اُردو والوں پر یہ فرض ہے کہ اس کتاب کے مندرجات پر آج کے حالات کی روشنی میں غور و خوض کریں، وہاں گجرال صاحب سے بھی درخواست ہے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات جن پر وقت کی گرد جم چکی ہے، دفتر خارجہ کے کاموں سے تھوڑا سا وقت نکال کر وزارت تعلیم اور کابینہ کو توجہ دلائیں کہ اگر ان سفارشات پر عمل درآمد اب بھی نہ ہوا تو پھر کب ہوگا؟

ستاتی ہے اک تبسّمِ گُل فرصتِ بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

ایک بیدار مغز وزیر اعظم

کلدیپ نیر

وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے کہا "میں تو ایک بار کے لئے وزیر اعظم ہوں۔ دوبارہ آنے کی میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ ایک بار کے بعد یہ کام ختم ہو جائے گا اور میں گھر چلا جاؤں گا۔" انہوں نے یہ بات کسی انٹرویو میں نہیں کہی۔ میں ان سے اکیلے میں بات کر رہا تھا اور یہ غیر رسمی گفتگو ان کی رہائش گاہ نمبر ۲ ریس کورس روڈ پر کچھ روز پہلے ہوئی تھی۔

میرے خیال میں وہ اس عہدے سے چپکے رہنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔ دراصل یہی ان کی طاقت ہے۔ کسی جوڑ توڑ کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ وہ اس عہدے پر بنا کسی فکر کے فائز ہیں۔

ان کی جماعت جنتا دل میں جھگڑے انہیں پریشان کرتے ہیں لیکن انہوں نے خود کو ان جھگڑوں سے دور رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ انہیں پارٹی کی صدارت پیش کی گئی لیکن انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا "میں اس بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔" وہ محسوس کرتے ہیں کہ سیاست کی پیچیدگیوں میں پڑنے کے بعد وہ اس نصب العین سے دور چلے جائیں گے جو ان کی نگاہ میں ہے۔

وہ ملک کو ایک تصور دینا چاہتے ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں ریاستوں کے وزراء اعلیٰ سے اسی تصور کی بات کرتے ہیں۔ وہ جواہر لال نہرو کی طرح ریاستوں کے وزراء اعلیٰ کو ہر پندرہ دن بعد ایک خط لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قوم کے سامنے اب وہ مقصد اور نصب العین نہیں رہا جو پہلے تھا۔ وہ پھر سے یہ تصور زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں پھر سے نصب العین پر نگاہ مرکوز کرنی چاہئے۔

گجرال کہتے ہیں "نہرو ہمیشہ اسی تصور کی بات کرتے تھے۔ اس سے قوم کو وہ رخ ملے گا جس کی اسے ضرورت ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ وزیر اعظم سیاست کی مصلحتوں کی بجائے اصولوں پر چل رہے ہیں۔ ان کے دل میں جو سچائی ہے وہ اسے ہر قیمت پر بیان کریں گے۔

میں وزیر اعظم کی رہائش گاہ ریس کورس روڈ پر جتنے بھی وزراء اعظم سے ملا ہوں گجرال ان سے کتنے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ ملی جلی سرکار کے جس کے وہ قائد ہیں روز روز کے مسائل کے باوجود وہ پوری طرح پرسکون اور گرم جوش دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں حالات کا تجزیہ کرنے اور واضح اور پرزور الفاظ میں کہنے کا ملکہ اور عطیہ حاصل ہے لیکن وہ ان عطیات کا استعمال سیاسی یا اقتصادی رہنماؤں کے لئے نہیں بلکہ عوام سے گفتگو کرنے کے لئے کیا کرتے ہیں۔

ویسے وزیر اعظم کی رہائش گاہ ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔ حفاظتی انتظامات پہلے کی مانند ہی سخت ہیں۔ آواز نہ کرنے والی ایک کار آپ کو گھر کے پورچ میں لے جاتی ہے اور سفید وردی میں ایک چپراسی آپ کو انتظار کرنے کے لئے ایک کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ کمرہ ویسا ہی ہے جیسا کہ برسوں پہلے تھا۔ تاہم ڈرائنگ روم یعنی ملاقاتیوں کے کمرے کی شکل کچھ بدل گئی ہے۔ دیواروں پر حسین اور وزیر اعظم کے چھوٹے بھائی ستیش گجرال کی بنائی ہوئی بڑی بڑی تصویریں آویزاں ہیں۔ کھڑکی کے آگے پردے ہیں اور کھڑکی میں دھوپ کو روکنے کے لئے پودوں کے گملے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ سوچ کر کیا گیا ہے کیونکہ اس سے خوبصورتی اور فن کے تئیں احساس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اندرا گاندھی میں بھی کچھ جمالیاتی احساس تھا لیکن وہ بھی اس کوٹھی میں نہیں رہیں۔

گجرال نے مجھ سے کہا "میں نہیں چاہتا کہ میرے پاس بہت سی فائلیں آئیں۔ بلکہ میں نے تو کام اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ بہت کم کاغذات میرے پاس آتے ہیں۔ میں تو ملک کے اخلاقی اصولوں پر توجہ مرکوز کرکے انہیں بحال کرنا چاہتا ہوں اور جو نظریات ہماری قومی تحریک کو متحرک کر رہے تھے انہیں پھر سے بیدار کرنا چاہتا ہوں۔" برطانوی دور حکومت میں گجرال ان کے والد اور والدہ کئی بار جیل گئے۔

موجودہ حالات کے ذکر کے سلسلے میں میں نے گجرال سے پوچھا کہ وہ بہار کے وزیر اعلیٰ لالو پرساد یادو کو ان کے عہدے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟" اس کے جواب میں گجرال نے کہا کہ ہندوستان میں لوگ اختیار اور مطلق العنانی کے معنوں کو غلط ملط کر دیتے ہیں۔ اگر اس وقت میں نے یہ کارروائی کی ہوتی تو مجھے ڈکٹیٹر کہا جاتا۔ میں ہر کام مناسب ڈھنگ سے کرنا چاہتا ہوں تاکہ لوگ مجھ پر یہ الزام نہ عائد کریں کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ میں صابر ہوں۔ مجھے چندر دیو پرساد ورما وزراء کی کونسل سے مستعفی ہو جانے کے لئے رضامند کرنے میں دو دن لگے۔ میں انہیں برطرف کرنے کے لئے اپنے عہدے کا استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔" گجرال کی رغبت کا کام خارجہ معاملات ہیں۔ انہیں فخر ہے کہ نہرو کے بعد انہوں نے ملک کی خارجہ پالیسی کو پھر سے استوار کیا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی کوششوں کو "گجرال نظریہ" کا نام دینے سے ہچکچاتے ہیں لیکن انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس پر وہ مطمئن ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بنگلہ دیش سے پانی کے بارے میں جو معاہدہ کیا گیا ہے اس کے اچھے نتائج شمال مشرقی خطے میں حاصل ہونے لگے ہیں۔ "تین ہفتے پہلے میں جب اس خطے میں گیا تو میں نے یہ نتائج دیکھے۔" نیپال کو ہندوستان کے علاقے میں سے گذرنے کا جو حق دیا گیا ہے اس کے بارے میں گجرال کا خیال ہے کہ

اس سے نیپال، بنگلہ دیش اور اس سے بھی آگے ممالک سے تجارت بڑھے گی اور اس سے شمالی مشرقی خطے کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ (جب گجرال نے کنڈ نگاہ کے حق پر رضامندی کا اظہار کیا تو نیپال کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ دونوں نے کہا کہ وہ خود ہندوستان مخالف جذبات کو ہوا دیتے رہے ہیں لیکن اب گجرال کے دورے کے بعد انہیں ہندوستان کی دوستی کے خلوص کے بارے میں یقین ہو گیا ہے۔ گجرال کہتے ہیں کہ روپوش ناگاؤں اور آسام کے متحدہ محاذ آزادی کے رہنماؤں سے بات چیت جاری ہے لیکن بات چیت نازک مرحلے پر ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس بارے میں وضاحت نہیں کی۔ لیکن انہیں یقین ہے کہ ۱۵ اگست سے پہلے ناگالینڈ اور آسام دونوں علاقوں میں گولی باری بند ہو جائے گی۔ یہ واقعی ایک کامیابی ہوگی کیوں کہ وہاں لمبے عرصے سے امن نہیں ہوا۔ سرکار کے ساتھ بات چیت میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے گجرال کو کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں ہمیشہ اچھی اُمید رکھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے رشتوں میں بڑے پیمانے پر اصلاح ہوگی (وہ بھی سیکریٹری امور خارجہ سلمان حیدر سے ملے نہیں ہیں) لیکن گجرال کو اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ دونوں ممالک دوستی اور مصالحت کے ایک دور کی جانب آگے بڑھ رہے ہیں جس سے رشتوں کی تاریخ کا ایک نیا ورق پلٹے گا اور محاذ آرائی، کینہ پروری اور دشمنی کا دور پیچھے رہ جائے گا۔

انہوں نے پاکستان سے تین ہزار کلوواٹ بجلی کی خرید کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ایک بار جب یہ بجلی ملنے لگی تو ہریانہ اور پنجاب کے کچھ اور علاقوں میں خوشحالی آئے گی۔ بجلی کی خرید کے بعد تجارت بھی ہوگی جس سے پاکستان کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ جس کا پتہ تھوڑی دیر میں لگ جائے گا۔

وزیر اعظم نے کہا کہ انہوں نے غیر ملکی سرکاروں سے تعلقات استوار کرنے کی غرض سے سیاستدانوں کو وہاں بھیجنے کا پرانا سلسلہ بند کر دیا ہے۔ کابینہ کے سیکریٹری سبرامنیم واشنگٹن کا دورہ کر کے آگئے ہیں۔ وہ امریکہ کی وزارت خارجہ میں اپنی بات چیت سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ جب میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا تو اس وقت سبرامنیم وزیر اعظم کو اپنی بات چیت سے آگاہ کر رہے تھے۔

گجرال مجھ سے کہہ رہے تھے "مجھے آنے میں اس لئے دیر ہوگئی کہ کابینہ کے سیکریٹری انہیں اپنے امریکہ کے دورے کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کا دورہ مفید رہا ہے۔ امریکہ سے ہمارے تعلقات کافی حد تک بہتر ہوئے ہیں۔"

میں گجرال سے اتوار کے روز ملا لیکن ان کے روزمرہ پروگرام میں ہفتہ یا اتوار کا کوئی الگ مطلب نہیں ہے۔ گجرال کہتے ہیں کہ "وزیر اعظم بننے سے پہلے انہوں نے جن وزارتوں میں کام کیا ہے وہ ان کے لئے ابتدائی تربیت گاہیں تھیں۔ اب دن میں ۱۶ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی میں دیکھتا ہوں کہ میں ہر روز کا پورا کام نہیں نپٹا سکتا۔ دوروں سے حالت اور بھی خراب ہو جاتی ہے اس لئے میں آدھے دعوت نامے ٹھکرا دیتا ہوں۔ پھر بھی مجھے سفر کے لئے جانا ہی پڑتا ہے۔"

لیکن گجرال کہتے ہیں کہ ان دوروں سے انہیں ملک کے مختلف حصوں سے رابطہ بنائے رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ دلی میں رہ کر انسان آزردہ خاطر محسوس کرتا ہے کیونکہ یہاں لوگ ہر وقت آلو، پیاز، دال یا پٹرولیم کی مصنوعات کی قیمتوں کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں جب ریاستوں کے دورے پر جاتا ہوں تو میں وزراء اعلیٰ کے سامنے وہ نصب العین رکھتا ہوں جسے سامنے رکھ کر قوم کو آگے بڑھنا چاہئے۔ میں انہیں یہ بات لکھ کر بھی بتا سکتا ہوں لیکن بات کے زبانی بیان کرنے کا اثر بہتر ہوتا ہے۔

اسے تصور یا خواب جو کچھ بھی کہا جائے یہ وزیر اعظم کے خیالات پر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ ہندوستان کے لوگ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے وزیر اعظم کا ساتھ دیں گے بشرطیکہ وہ عوام کو ملک کے بارے میں اعتماد اور اُمید پھر واپس دلا سکیں۔

عہدِ جدید کے چیلنج ...... ڈاکٹر قمر رئیس

ملک کے ممتاز سیاسی رہنما اور دانشور اندر کمار گجرال کے مضامین روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

کچھ مضامین ادبی ہیں کچھ کا تعلق ہماری سیاسی زندگی سے ہے۔ دو مضامین کشمیر کی سیاست کے بدلتے رُخ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تین چار مضامین اُردو زبان و ادب و صحافت کے بارے میں ہیں اور ایک مضمون "سوویت یونین کا زوال" میں سوویت یونین میں بحیثیت سفیر طویل قیام کے تجربات اور تاثرات کو پیش کیا ہے۔ دو مضامین ایسے بھی ہیں جو افغانستان اور ہندوستان کے مشترک مفادات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک دلچسپ اور اہم مضمون "بیادِ فیض" ہے۔ اس میں انہوں نے آزادی سے پہلے کی لاہور کی مشترکہ تہذیب اور زندگی کو یاد کیا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی فیض احمد فیض سے ان کے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔ گجرال صاحب کی شادی کی تقریب میں بھی فیض نے شرکت کی تھی۔ لاہور کے بعد گجرال صاحب نے فیض احمد فیض اور ان کی بیگم ایلس فیض سے اُن پُرخلوص ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے جب وہ ہندوستان آئے یا اُن کی سفارت کے زمانے میں ماسکو گئے۔ ایک موقع پر جب خود گجرال صاحب اسلام آباد پہنچے یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں جو فیض کا ۷۰ واں جشن منایا گیا اور ہندوستانی اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر فیض صاحب کے پروگرام نشر کئے گئے تو اس کے پیچھے اندر کمار گجرال ہی کی تحریک کام کر رہی تھی۔ میں خود اس جشن فیض کمیٹی کا سیکریٹری تھا۔ اس سلسلے میں گجرال صاحب نے فیض کے داماد ہاشمی کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ "اس جشن کا اثر پاکستان کے لوگوں پر بہت گہرا تھا جس میں لوگ ہندوستان کی جمہوریت و لبرل سماج کی باتیں کرتے رہے۔ یہاں بھی پاکستان میں بھی ایک جشن کمیٹی بنائی گئی۔ یہ خبر نکلتے ہی اس کے سب ارکان بمع سے ساتھ گرفتار کر لئے گئے اور ہم نے ان کا جشن دن پر ملی بارگلی کے تھانے کے کمرے سیل میں گزارا۔"

گجرال صاحب نے لکھا ہے کہ آزادی سے پہلے فیض امرتسر کے کالج کو چھوڑ کر لاہور میں ان کے کالج میں انگریزی ادب کے استاد ہو گئے تھے۔ اس طرح ان کا ایک رشتہ استاد و شاگرد کا بھی تھا۔ آزادی سے کچھ پہلے ملک کے نوجوانوں میں اشتراکیت اور انقلاب کی طاقتوں سے جو وابستگی پیدا ہوئی تھی گجرال صاحب نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فیض کی شاعری سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار بھی کیا ہے اور جگہ جگہ ان کے خوبصورت اشعار نقل کئے ہیں۔

ایک اور مضمون ہے "ہندوستان میں اُردو کا مسئلہ" یہ وہ خطبہ ہے جو انہوں نے ۱۹۹۲ء میں کل ہند اُردو کانفرنس لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ اس میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ "اگر گجرال کمیٹی کی ساری سفارشات مان بھی لی جائیں تب بھی بیاست اس کی ضمانت نہیں ملتی کہ ہندوستان میں اُردو پوری طرح فروغ پا سکے گی اس لئے کہ کوئی زبان اور اس کا کلچر اپنی ترقی و بقا کے لئے حکومت کے احکام اور اس کی امداد پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔" گجرال صاحب لکھتے ہیں "کمیٹی کا خیال تھا کہ اُردو اس ملک میں پھلی پھولی کے باوجود اس بات کے کہ ہندی کی طرح یہ بھی ایک نئی زبان تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے تاریخ کے رجحان اور رُخ کو پہچانا تھا۔ ہندوستان کے کلچر اور آزادی کی تحریک میں اس کی اسی صفت کے تقاضے پورے کر رہی تھی۔ اُردو میں لکھنے والے اپنے پڑھنے والوں کو ملک کی ذہنی نشوونما میں شامل ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔" گجرال صاحب نے لکھا ہے کہ "جب تک اُردو بولنے والے عہدِ جدید کے چیلنج کو نہیں سمجھیں گے اُردو کا مستقبل زیادہ روشن نہیں ہو پائے گا۔" انہوں نے لکھا ہے کہ اس ملک میں اُردو اگر ترقی کرے گی تو ملک کی یکجہتی میں اپنا کردار تو نبھائے گی ہی اس کے ساتھ ہی وہ کہیں اس عمل کا ذریعہ بن جائے کہ اس کے ذریعے بچھڑے ہوں الگ ہوں کو بڑھاوا ملے۔"

اپنے ایک لیکچر "صحافی مجاہد کے روپ میں" گجرال صاحب پھر آزادی سے پہلے کی صحافت کو یاد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ بچپن سے ہی میری سیاسی تربیت ملاپ اخبار کے ذریعے ہوئی۔ اس وقت اکثر مجاہدینِ آزادی صحافی بھی تھے جو قلم کے ذریعے بھی آزادی کے آدرش پانے کی جدوجہد کرتے تھے۔ اسی "ملاپ" کے ایڈیٹر رنبیر کو جب پھانسی کی سزا ہوئی جو بعد میں ہائی کورٹ میں برقرار رہی تو انہوں نے "پھانسی کی کوٹھری" کے عنوان سے سلسلے وار مضامین لکھے جن کو پڑھ کر نوجوانوں کو ایک نیا حوصلہ ملا۔" گجرال صاحب لکھتے ہیں کہ "رام لال اور بعض دوسرے مجاہد صحافیوں کی طرح پھر سوچتا ہوں کہ رنبیر جی کا نام بھی کیوں مرے میں لکھوں۔ ۲۷ گھنٹوں میں یا مجاہدوں میں؟ اس لیکچر کے آخر میں انہوں نے ہندوستانی معاشرے اور قومی زندگی کے بعض بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ آج کا مجاہد صرف وہی نہیں ہو سکتا جو سماج کی برائیوں اور کمزوریوں کو ہی فوکس میں لاتا ہے بلکہ وہ ہے جو سماجی ترقی کے کسی ایک مقصد کو مشن مان کر چلتا ہے اور سماجی سوچ پر اپنی چھاپ چھوڑتا ہے۔

ان کا مضمون "سوویت یونین کا زوال" دراصل سیاست فاؤنڈیشن لیکچر ہے جو انہوں نے ۱۹۹۱ء میں دیا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے سوویت نظام کے مثبت اور کمزور دونوں پہلوؤں کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ آخری دور میں گورباچوف نے جو اصلاحی اقدام کیں ان سے ان کی برتری ختم ہو گئی اور بازاروں، گلیوں اور اخباروں میں ان پر کیچڑ اچھالی جانے لگی۔ انہوں نے امریکہ کے ساتھ مکمل تعاون کا اعلان کیا پھر بھی سامراجی طاقتیں ان کو کوئی مدد دینے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ اس طرح ان کی غلط حکمتِ عملی اور بین الاقوامی صورت حال کی گمراہ کن تفہیم سوویت یونین کے زوال کا ایک بڑا سبب بنی۔" وہ لکھتے ہیں "وہ انقلاب جس نے دنیا بھر کو اپنے کھلے سماجی انصاف اور اقتصادی آزادی کا درس پڑھایا تھا، بعد میں اس کی ہاتھوں میں جکڑا جا رہی سے چھڑ پھڑا رہا تھا۔"

الغرض گجرال صاحب کے مضامین معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہیں اور عالمی سطح پر پیدا ہونے والے مسائل کو ہندوستان کے قومی تناظر اور ایک وسیع انسانی تناظر میں دیکھنے کی کوشش بھی ہے۔

نیا شعور، ادیب اور آج کے فرائض

(گولڈن جوبلی انجمن ترقی پسند مصنفین میں خطبۂ صدارت)

اندر کمار گجرال

سردار جعفری صاحب، محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ، خواجہ احمد عباس صاحب، باہر سے آئے ہوئے ڈیلی گیٹ صاحبان، خواتین و حضرات، دوستو!

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اس قدر اوس شدید سردی کے باوجود اس محفل میں شامل ہونے کے لئے آئے ہیں۔

میں منتظمین کا اس لئے بھی شکر گزار ہوں کہ مجھ ناچیز کو اس قابل سمجھا گیا ہے کہ میں استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے آپ کو خوش آمدید کہوں۔

آپ کی کرم فرمائی کے صدقے مجھے آج ان پرانے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کا موقع ملا ہے جن کے ساتھ عمر کا ایک حصہ بیتا تھا اور جن کی تحریروں نے میرے جیسے کئی لوگوں کی سوچ پر اثر چھوڑا ہے۔ اس کانفرنس کے طفیل مجھے آج کئی پچھلے قرضے چکانے کا بھی موقع ملا ہے۔ یہ قرض بھاری ہے۔

میں کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ اگر ترقی پسند مصنفین کی تحریک آزادی کی جدوجہد کی ہم رکاب نہ ہوتی تو میری پیڑھی کی ذہنی نشوونما میں ایک عجیب قسم کی بگاڑ آ گئی ہوتی۔ آپ ہی کی اس تحریک نے مجاہدوں کو نہ صرف ان کے نعرے دئے بلکہ آنے والے یگ میں نئے سماج کی تصویر کو ذہنوں میں پختہ کر دیا۔

ترقی پسند مصنفین کی تنظیم بنے پچاس برس بیت گئے۔ آپ میں سے بہت سے حضرات ایسے ہیں جو شروع سے ہی اس کی صف اول میں تھے۔

یہ محض اتفاق تھا یا وقت کے تقاضوں کا احساس کہ ترقی پسندی کی اس تحریک نے اس وقت جنم لیا جب ہماری سیاسی جدوجہد کا کارواں ایک اہم موڑ مڑ رہا تھا۔

لاہور میں راوی دریا کے کنارے ہندوستانی عوام نے پورن سوراج حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ گاندھی جی کی قیادت میں آزادی کی لہر میں ایک نیا جوش اور نئی ترنگ آ گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ مجاہدوں اور عام لوگوں کے دلوں میں نئے سوال اور نئے خدشے بھی ابھرنے شروع ہوئے۔ آنے والی آزادی کا کیا رنگ ہوگا؟

اس کا سماجی روپ صدیوں سے لٹے ہوئے پچھڑے ہوئے ہریجن اور کسان کو خاطر میں لائے گا یا صرف اوپری سطح کی ایلیٹ (شہری) ہی سب سمیٹ لے جائے گی۔

منشی پریم چند کی گئودان، رنگ بھومی، کرم بھومی، پختگی اور گہرائی کے ساتھ سماجی رشتوں کی بے انصافی، عورت کے استحصال، توہم پرستی اور فرقہ واریت کا پردہ چاک کر رہی تھیں۔

شدت کے ساتھ وہ بنیادی سماجی تضادوں...... کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کچھ ذہنی الجھنیں تو لینن کا انقلاب صاف کر رہا تھا، کچھ ہماری اپنی آزادی کی تحریک کے علم بردار۔

جواہر لال نہرو جوان سال تھے۔ نئے یگ کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ لاہور میں اپنے صدارتی خطبے میں انہوں نے پرانی روایتوں کو توڑ کر کسانوں، مزدوروں، ادیبوں، طالب علموں کی صفوں کو جھنجھوڑا تھا۔

وہ ہندوستانی انقلاب کی حدوں کو برٹش کی سب سرمایہ داری مخالف صفوں سے جوڑ رہے تھے۔ یہ ایک نئی بات تھی جو ہندوستانی احساس آزادی کو مارکسیائی نقطۂ نظر اور جس کی طرف کھینچتی تھی۔ کچھ برس پہلے وہ ماسکو ہو آئے تھے اور دیکھ آئے تھے کہ سماجی اور اقتصادی رشتوں کی نئی اختراع ایک نئی تہذیب اور نئے کلچر کو جنم دے سکتی ہے۔

جوں ہی ترقی پسندی کی بات ادیبوں میں اٹھی تو دقیانوسیت نے اس کے خلاف مورچہ لیا۔ نہ صرف اردو میں بلکہ ملک کی ہر زبان میں لکھنے والے اب دو صفوں میں بٹ گئے۔ مورچے نے نئے الفاظ اختراع کئے۔ "ادب برائے ادب ہو کہ ادب برائے زندگی"۔ لیکن قومی دھارا کی قوت اور توانائی نے اس مباحثے کی طرف توجہ بٹنے نہیں دی۔

ترقی پسند ادیبوں کی صفوں میں اب ہر زبان اور بھاشا میں لکھنے والے شامل ہو گئے۔ لکھنؤ کانفرنس تو اب ایک تاریخی یادگار ہے۔ منشی پریم چند صدارتی خطبہ اور بعد کی بات چیت ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم جگہ رکھتی ہے۔

ترقی پسند ادیب آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی ہم آہنگی اور یکجہتی کی طرف بھی توجہ دے رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے جو سامراج زبانوں اور بھاشاؤں کے آدھار پر کھڑی کر رہا تھا اور ان میں شگاف آ رہا تھا۔ ملک بھر میں قومی دھارا کے تصور کو قائم کرنے میں اس تحریک کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ یہ تصور رہن کر چلا تھا کہ گو تاریخی طور پر ہمارے ملک کی سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہی ہیں تو بھی اس خطے کی زمین کے کلچر، زبان، ادب، آرٹ، موسیقی، فن تعمیر اور دوسری ثقافتی قدریں بنانے میں ہزاروں سال کی محنت اور ریاضت صرف کی ہے اور اسی نے ہندوستانیت کی وحدت کے تصور کو قائم رکھا ہے۔ Macaluay نے پچھلی صدی میں سامراجیانہ ہیکڑی کے ساتھ سنسکرت سمیت ملک کی کل زبانوں کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا

کرنا میں سائنسی تنگ کے خیالات کا ذریعۂ اظہار بننے کی اہلیت نہیں ہے۔ یہ سوچ اس کے خیالات کے ساتھ بحث کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن ترقی پسند مصنفین نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ سائنس چاہے سطحی ہو یا فزیکل اس کو ہمارے حقیقی لوک ورثہ اور Ethos میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

اس سطحی لوک ورثہ کو پہچان کر ملک راج آنند نے خوشی پر ہم چند اسکول کی ترجمانی انگریزی میں ناول قلی Cooly لکھ کر دی۔

جب بنگال میں بھوک سے لاکھوں خالی پیٹ تڑپ کر مرنے لگے تو کرشن چندر نے ان داتا لکھ کر لوگوں کی بے چارگی اُوپر سے طبقے کی بے حسی اور حاکموں کی تنگ Cynic بینی کو دل ہلا دینے والے پیرایہ میں پیش کر دیا۔

میں اور میری بیوی جیسے لوگ اس زمانے میں یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ آزادی کی جدوجہد ہمیں اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں لے آئی تھی اور اسی ناطے ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ایک ذہنی اور جذباتی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

سردار جعفری صاحب میں سے آپ میں بہت لوگ اسی تنگ کے لوگ ہیں۔ آپ جیسے لوگ تو زیادہ خوش قسمت تھے جو قلم اور جسم دونوں کے ساتھ اس یدھ میں شامل تھے۔ میرے جیسے لوگ آپ کے ساتھی بھی تھے اور مداح بھی۔

آزادی کی جدوجہد کو تو نہ جانے میرے جیسے کتنے لوگوں نے کیا دیا لیکن آپ صاحبان نے ہم لوگوں کے ذہن اور سوچ کی تشکیل کر دی۔ اسی نے سماج کے ساتھ ایک نہ ٹوٹنے والی کمٹمنٹ بھی۔

سطحی اور ذاتی زندگی صرف سیاست تک محدود تھوڑی ہی ہوتی ہے اس اصلیت کو بھی ترقی پسند ادیبوں نے پہچانا تھا۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ عصمت آپا جو آج یہاں ہیں ابھر کر سامنے آئیں۔ انہوں نے عورت خاص کر مسلمان سماج کی عورت کو کھینچ کر سطحی پردے سے باہر نکالا۔ اس کی بے عزتی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی پسماندگی اور اس کے استحصال کو ظاہر کرنے کے لئے۔

سطحی Hyprocracy نے ان کی تحریر کو فحاشیت Pornography کی عینک لگا کر دیکھا۔ لیکن نئی پیڑھی ان کی اور سعادت حسن منٹو کی تعریف کر رہی تھی اور کئی کم ہمت دقیانوسی بزرگ لوگوں سے آنکھ بچا کر ان کو پڑھتے بھی دیکھا۔

چند برس پہلے میں روس میں تھا۔ دسمبر کی برفانی سردی میں وہاں کے دوستوں کی مدد سے میری بیوی نے اور میں نے رشید جہاں کی قبر کا پتہ لگوا کر اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے تو وہاں کے سفارت خانے میں دوست ان کے متعلق پوچھنے لگے۔ اس نئی پیڑھی نے ان میاں بیوی کی کاوشوں اور بے لاگ جدوجہد کو نہیں دیکھا تھا۔ ان ہی لوگوں کی ڈالی ہوئی بنیاد پر تو وہ عمارت بنی جس کی طلائی سالگرہ ہم آج منا رہے ہیں۔

تحریک کی بات تو شروع ہی بڑے بھائی سے ہوتی ہے۔ نوجوانی میں ان کی دور نظری اور بعد میں ان کی ثابت قدمی نے اس تحریک کو بہت کچھ دیا ہے۔ آپ میں سے بہت سے تو ان کے شروعات سے ہی ہم رکاب رہے ہوں گے۔ میرا ان کے ساتھ رشتہ شروع میں نابالغ تھا اور بعد میں بہت قریب کا۔

بطور طالب علم کے اور آج بھی موسیقی کے انداز میں بھٹے طور پر بے بہرہ رہا ہوں لیکن تو بھی ہمارے ستم جلے ان کے گیت:

مظلوموں نے ملکوں ملکوں اب جھنڈا لہرایا ہے
جو بھوکا تھا، جو ننگا تھا، اب غصہ اس کو آیا ہے

سے ہی شروع ہوتے تھے اور اس میں میری بے بہری بھی شامل رہتی تھی۔ لیکن لوگ کوئی موسیقی سننے تھوڑے ہی آتے تھے۔ وہ تو جذبات کے جوش اور تحریک سے ہم آہنگی اور ہماری حوصلہ افزائی کرنے آتے تھے۔ جانا تو خیر سب کو ہی ہے لیکن سجاد ظہیر اور رضیہ آپا کی دین کی یہ تحریک ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔

بڑے بھائی کے ساتھ فیض کا بہت نزدیک کا رشتہ تھا۔ اور یہ زندگی کی ستم ظریفی تھی کہ وہ جیل میں لمبے عرصے ساتھی بھی تھے اور موت کے وقت الماتا میں بھی وہ قریب تھے جب فیض ان کے جسم فانی کو دفنانے کے لئے دہلی لے کر آئے تو وہ غم کا مجسمہ تھے۔ اپنی بے چارگی اور جذباتی قربت ان کے دردناک المیہ میں تھی۔

نہ اب ہم ساتھ سیر گل کریں گے
نہ اب مل کر سوئے مقتل چلیں گے

چاہے بات ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی ہو یا اس برصغیر کے ادبی ماخذوں کی فیض کا نام ان کے ساتھ پوری طور پر جڑ گیا ہے۔ ملک تو بٹ گیا تھا لیکن ان کی شخصیت شاعری تخیل اور عقیدے سیاسی سرحدوں کو نہیں پہچانتے تھے۔

ذاتی طور پر ان کے ساتھ آپ سب کی طرح میرا رشتہ قریب کا تھا۔ ایک معنی میں وہ میرے استاد بھی تھے کیونکہ لاہور کے زمانے میں وہ انگریزی ادب کے پروفیسر تھے اور میں ان کا طالب علم۔ لیکن یہ رشتہ جلد ہی دوستی میں بدل گیا اور آخری دن تک قائم رہا ہے۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جدید ادب اور شاعری کے ساتھ ان کا نام علامتی بن چکا ہے۔ فیض کی شاعری میں اپنی ہی تب و تاب اور فکری آفاقیت ہے۔ وہ ایک پل بھی تھے جس نے ہندوپاکستان کے ادبی اور انسانی رشتوں کو قائم رکھا۔ یہ فخر بھی تو اردو زبان میں لکھنے والے ترقی پسندوں کی ہے۔ لیکن یہ تحریک کبھی بھی صرف ایک زبان تک محدود نہیں تھی۔ ہندی اور اردو تو خیر ایک ہی خطے اور جذبات کی ساتھی زبانیں ہیں لیکن اس سوچ کا اثر تو بھاشاؤں کی سرحدوں کو توڑ گیا تھا۔

لکھنؤ کی کانفرنس میں خاص طور پر ہندی میں لکھنے والے راہول سنکرتیاین، یش پال، رام بلاس شرما تو اس تحریک کے ستون تھے۔

جلد ہی یہ ہونے لگا کہ بیشتر ادیبوں کی تحریریں دونوں لپیوں Scripts میں چھپنے لگیں۔ منشی پریم چند سے اس کی شروعات ہوئی تھی اور سیاسی کھینچاتانی کے باوجود ان دونوں زبانوں میں لکھنے والوں کے آپسی رشتے اور یاروں کی ہم آہنگی میں گہرا ساتھی پن تھا۔

کسی وقت دلی کو اُردو کا گھر مانا جاتا تھا لیکن اب تو ہم پنجابیوں نے یہاں آکر اس کو نیا اور بنا دیا ہے اسی طرح تو نظر پنجابی زبان میں لکھنے والے ترقی پسندوں کی طرف بھی جاتی ہے۔

گوربخش سنگھ پریت لڑی نے پنجابی زبان کو ایک سادہ پن اور طرز اظہار دیا تھا۔

سوہن سنگھ جوش آزادی کے ایک مجاہد اور ادیب تھے جو اس زبان کو ایک اتہاسک روپ دے گئے اور آج کرتار سنگھ دگل اور امرتا پریتم یہ پرچم تھامے ہوئے ہیں۔

میرا مقصد کچھ کہنا نہیں ہے صرف یہ کہنا ہے کہ خیالات میں ہم آہنگی، نظریے کی وسعت، عام آدمی کے دُکھ درد میں شرکت کا اظہار اب ہندوستان کی سبھی زبانوں میں ہونے لگا تھا۔ اور یہی اس تحریک کی اصلیت تھی۔

یوں تو ہندوستانیت اور اس کی Identity کی تلاش پچھلی صدی سے شروع ہو گئی تھی۔ اور بھارتندو جیسے ادیب ہندی میں اور جیسے لکھنے والے بنگالی مراٹھی اور تامل میں اس یکجہتی کی بات کر رہے تھے لیکن جوں جوں آزادی کی تحریک کا دھارا قوت پاتا گیا ویسے ویسے سامراج کی کاوش مذہب اور جاتی واد کے نام پر زور پکڑتی گئی۔

کوشش یہی تھی کہ لوگ دھرم، مذہب اور فرقہ واریت کو ایک ہی روپ میں دیکھنے لگیں۔

انیسویں صدی سے، خاص طور پر غدر کے بعد سے برطانوی سامراج نے ہندوستان کے لوگوں کو بطور ہندوستانی کبھی نہیں مانا۔ چاہے بات سرکاری نوکری کی ہو یا میونسپلٹی کے چناؤ کی ہر شخص کی شناخت اس کے مذہب اور جات سے ہونے لگی تھی۔

بد قسمتی سے جداگانہ طرزِ انتخاب نے اس پالیسی کو تقویت دی تاکہ ہندوستان کی تہذیبی یک جہتی...... کو زک پہنچے اس میں کامیابی بھی ہوئی۔

ترقی پسند ادیبوں کی ایک دین یہ بھی تھی کہ وہ اس فرقہ وارانہ نظریے کے شکار نہیں ہوئے اور انہوں نے اس نظریے اور ذہنیت پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ ٹیگور، اقبال، جوش، سمترانندن، بھارتی اور پریم چند نئی قدروں اور روایتوں کی علمبرداری کر رہے تھے۔

ترقی پسند ادیبوں کی دوسری کانفرنس ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں ہوئی تھی۔ رابندرناتھ ٹیگور اس کے صدر تھے۔ بیماری کی وجہ سے وہ خود تو نہ آپائے لیکن وہ خطبہ جس میں انہوں نے سماج کی نبض شناسی پر زور دیا تھا وہ آج بھی اتنا ہی متعلقہ Relevant ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "قوم میں نئی روح ڈالنا اس کی شجاعت کے گیت گانا اور اس میں نئی اُمیدیں اور خوشی پیدا کرنا مصنف کا فرض اولین ہے۔"

آزادی آئی تو خون میں نہائی ہوئی تھی اور قومی تقاضوں اور فریضوں نے نئی شکل لے لی۔

لوگ فسادزدہ تھے۔ گھربار اور عزت لٹ گئی تھی لیکن اس دور میں بھی ترقی پسند ادیبوں نے اپنی سوجھ بوجھ کو نئی توجیہ دیا نئی تحریک دیا۔ یہ سال جواہر لال نہرو کی شتابدی کا سال ہے اور اس کے ساتھ ہی ہماری آزادی کی چالیسویں سالگرہ۔

اسی لئے کچھ وقفے دہرانے کا کچھ اپنی Balance Sheet پر نظر دوڑانے کا بھی موقع ہے اس میں تو کوئی شک نہیں کہ بطور قوم ہم نے کئی دشوار چوٹیاں سر کی ہیں لیکن آج کا ماحول فکر اور مجبوری سے بھرپور ہے۔

قومی یکجہتی کو اندرونی اور بیرونی خطرات کا سامنا ہے کسی حد تک سیاسی کم نظری اور کسی حد تک موقع پرستی نے مل کر پھر سے تشدد اور فرقہ وارانہ پرائے پن کا ماحول پیدا کردیا ہے۔ مذہب کے نام پر ایک دفعہ تو ملک بٹ ہی چکا ہے۔ اب پھر وہی رٹ ایک طرف اور بھاشائی الگ پن دوسری طرف خطرے بنا رہے ہیں۔

پنجاب ہو کہ آسام، گجرات ہو کہ میزورام ہماری قومی سالمیت کو کئی قسم کی چنوتیاں مل رہی ہیں۔

یہ موقع کوئی سیاسی مباحثے کا نہیں اور نہ ہی تفصیل سے کسی مسئلے پر بحث کرنے کا۔ لیکن یہ تو ادیبوں کی کانفرنس اس بات کی نشاندہی تو کر سکتی ہے کہ اس وقت اہل قلم کے سامنے کیا مسائل ہیں اور اس میں ہم سب اجتماعی طور پر کوئی راستہ نکال سکتے ہیں یا نہیں؟

آج کے اخبار، رسائل، کتاب اور ٹی وی کے یگ میں لکھنے والوں کی اہمیت پہلے سے تو بڑھ گئی ہے لیکن آج کے دور میں اُن کی نظر کی مقامی ہو اور دل کی دھڑکن میں اجتماعی درد کی ضرورت زیادہ ہے۔ جہاں پہلے برسوں میں اس تحریک نے آزادی کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالا تھا اب فرقہ واریت اور مذہبی تعصب کے خلاف اپنا رول ادا کرنے میں بھی ترقی پسندی کی ضرورت ہے۔

کئی دفعہ تو یوں لگنے لگتا ہے کہ آج ہر زبان میں لکھنے والے لوگ کچھ سکڑ گئے ہیں اور صرف اپنی اپنی بھاشا کے لئے ملکی انصاف طلب کرنے

لگے ہیں۔ یہ بات اُن کی آنکھ سے اوجھل رہی ہے کہ جب کُلی طور پر سماج کا اضافی طبقوں میں امتیاز کرنا ہو تو زبانوں میں امتیاز ایک لازمی امر ہو جاتا ہے۔ Caudwell نے یہ بات برسوں پہلے کہی تھی۔ بھاشا تو آخر لوگ ہی بولتے ہیں۔ اُن کے آپسی سماجی رشتے ہی زبانوں، ساہتیہ اور کلچر کے آپسی رشتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جب لوگوں کو اُن کا جائز سماجی حق ملنے لگتا ہے تو اُن کی زبان اور اُن کی سانسکرتی کو تو اس کا حصہ مل ہی جاتا ہے۔

صدر صاحب آپ میری گستاخی کو معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں ہماری اس تحریک کے اپنے ہی کردار میں پہلے جیسی گرم جوشی اور ثابت قدمی نہیں رہی۔

کئی دفعہ سماجی اور بعض دفعہ سیاسی اور وقتی مصلحتیں اس بنیادی Commitment کو کمزور کر رہی ہیں جس پر اس کی بنیاد پڑی تھی۔

ہماری کم نظری کئی دفعہ اس کے نظریے کو کمزور کر دیتی ہے۔ کچھ لوگ اپنی اپنی الگ ڈفلی بجا کر سوچتے ہیں کہ شاید ہندی، اُردو، پنجابی، تامل، بنگالی وغیرہ کا کوئی سانجھا محاذ بن ہی نہیں سکتا اور ہم ایک دوسرے سے پرے ہو کر اپنے ادبی اور سماجی فرائض نبھا سکتے ہیں۔

آپ اہلِ قلم آج اس تعداد میں مل کر بیٹھے ہیں تو یہاں سے زبانوں، ادب و تخلیقات کی ہم آہنگی کی شعاع پھر سے پھوٹنی ہی چاہیئے۔ شاید یہ سوچ کر آپ نے چند برس پہلے ترقی پسند مصنفین کی فیڈریشن کی بنیاد ڈالی تھی اور آج ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں اس کی برانچیں ہیں۔ یہ کانفرنس اُردو کے مصنفین کی تو ہے لیکن ساتھ ہی یہاں بڑے دھارے یعنی لسانی فیڈریشن کی بھی تو آواز ہے۔

یہ تو بدقسمتی ہے ہی کہ رجعتی سیاست نے ایک طرف اور فرقہ وارانہ تعصب نے دوسری طرف ہندوستان کی اس زبان یعنی اُردو پر گہرا گھاؤ کیا ہے اس کا عکس ایک فرقے اور رجعت پسندی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

اُردو کو انصاف دلوانے کی مانگ نہ تو کوئی مسلمانوں کی مانگ ہے اور نہ ہی کسی فرقہ وارانہ سیاست کی۔ یہ زبان ہماری مشترکہ تہذیب کی عکاسی کرتی ہے اس لئے اس کو بڑھاوا نہ دینے سے ہماری قومیت اپنا بہت بڑا اثاثہ گنوا رہی ہے۔

اُردو کا جھگڑا نہ تو ہندی سے ہے اور نہ کسی اور ہندوستانی زبان سے۔ بات یہ ہے تو صرف اتنی کہ اس میں بولنے اور پڑھنے والے ہندوستانی تہذیب کے ورثہ دار ہیں اور برابر کے حق دار۔ اسی اسپرٹ میں اردو کمیٹی نے جس کو صدر کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جامع سفارشات پیش کی تھیں اُن پر عمل ہو جائے تو راستہ کچھ ہموار ہو جائے گا۔

بات ذرا لمبی تو ہو گئی ہے لیکن صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ترقی پسند ادیبوں کو آج اپنی ہر زبان میں لوگوں کو سمجھانا ہوگا کہ "دھرم" اور فرقہ واریت میں بنیادی فرق ہے۔

عبادت، بندگی، پوجا پاٹ آتما کی شانتی تو مذہبیت کا عنصر ہے لیکن جب مذہب کا نام سیاسی یا ذاتی لین دین ہو جائے تو فرقہ واریت بن جاتی ہے اور اس کے بیوپاری فرقہ وارانہ جھگڑوں اور گروہ بندی میں فائدہ دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اسی کم نظری نے سیکولرزم کے معنی کو بھی بگاڑ کر رکھ دیا ہے لامحدود اس کا اشتراک و طاقت، بنیاد پرستی سے ملکی، رجعت پرستی، دقیانوسیت ہماری قومی جڑ کو کمزور کر رہے ہیں۔

دھرم نرپکشتا کا مطلب کوئی دونوں طرف رجعت پسندانہ قوتوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا نہیں ہے۔ جب سیاسی رہنما مندر مسجد کی طرف کھوجتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو عام لوگوں کا نظریہ جدیدیت کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔ اس نظریے کو صاف زبان میں کہنا آج ادب کا فریضہ بن گیا ہے۔

اگر ترقی پسند پوری قوت کے ساتھ توہم پرستی کے خلاف اور سائنٹفک نظریے کے حق میں آواز نہ اٹھائیں گے تو ہمارا شیرازہ بکھر جائے گا اور قومی قدم اُکھڑ جائے گا۔

پچھلے کچھ برسوں سے ہمارے ہاں دلت ادیبوں کی نئی پود نئی تیز ڈھنگ سے آواز اُٹھا رہی ہے۔ گو اس میں کمزوری یہ ہے کہ اس کا زیادہ زور Negativism اور منفیت پر ہے اور وہ ان تمام عناصر سے رشتہ نہیں جوڑ رہی جو ترقی پسندی کو جدید معنی دے سکتے ہیں لیکن یہ کچھ سماجی اشارے ہیں جن کو سمجھنا چاہیئے۔

یوں لگتا ہے کہ آج کے ماحول میں ترقی پسندوں کو پھر سے Partisan بننا پڑے گا اور اسی ناطے انہیں سماجی بے انصافی کے خلاف اور بھی زور سے بولنا ہوگا۔ آج فوری خطرہ تو اُن عناصر سے ہے جو دقیانوسیت، مذہبی منافرت، رجعت پسندی کی کھلم کھلا وکالت کر رہے ہیں۔ جہاں پچھلے سالوں میں آپ کی تحریک نے ملک کا سیاسی شعور بدل ڈالا تھا آج ہماری توجہ سماجی شعور بدلنے کی طرف ہی ہونی چاہیئے۔ اس کے بنا ہمارا سماج نہ تو جدید بن سکتا ہے نہ انصاف پسند۔

میں آپ کا ایک دفعہ پھر سے سواگت کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے آپ کی ساجھی سوچ ملک کو ایک اچھا موڑ دے گی۔

جاتے جاتے یہ بات مضمون لکھ کر کہیں یا اُسے غزل میں ڈھالیں۔ سخن میں قلم میں آج کے قومی فریضے آپ ہی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آپ سب کا شکریہ جو میرے آپ نے میری بات سنی ہے اور خاص کر صدر صاحب آپ کا اور باقی دوستوں اور ساتھیوں کا۔

گجرال کمیٹی: ایک جائزہ

ڈاکٹر خلیق انجم

۱۹۷۲ء میں ہندوستان کی مرکزی حکومت نے کمیٹی برائے فروغ اردو تشکیل دی تھی۔ جناب آئی۔ کے۔ گجرال کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا۔ گجرال صاحب اس وقت ورکس اینڈ ہاؤسنگ کے وزیر مملکت تھے۔ چوں کہ گجرال صاحب اس کمیٹی کے صدر تھے اس لیے یہ کمیٹی گجرال کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس زمانے میں گجرال کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تو میں دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں لیکچرر تھا۔ میرے محسن اور کرم فرما ڈاکٹر سروپ سنگھ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور گجرال کمیٹی کے ایک اہم رکن تھے۔ کمیٹی کے انتظامی امور کی دیکھ بھال اور اس کی رپورٹ لکھنے میں مدد کے لیے کمیٹی کو ایک ڈائرکٹر کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ نے اس عہدے کے لیے میرا نام تجویز کیا۔ کمیٹی کے جوائنٹ سکریٹری جناب علی جواد زیدی نے ڈاکٹر سروپ سنگھ کی اس تجویز کی پرزور تائید کی۔ چنانچہ اس عہدے پر میرا تقرر ہو گیا۔ کچھ دن مشہور ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں مرحوم اور ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین صاحب نے معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ کام کیا۔ اس کمیٹی نے ہندوستان کے بیشتر اہم مقامات کا دورہ کیا اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے میں کمیٹی کے ان تمام دوروں میں شامل رہا تھا۔ اس کمیٹی میں کام کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک تو مجھے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو کے مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا اور دوسرے مجھے گجرال صاحب، پروفیسر احتشام حسین، مالک رام صاحب، سجاد ظہیر صاحب، کرشن چندر، پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر گیان چند جین، عابد علی خاں صاحب اور اپنے خاص کرم فرما علی جواد زیدی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

گجرال صاحب ایک عظیم محب وطن ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھیں ہندوستان کی ہر چیز سے والہانہ عشق ہے۔ وہ ایک شریف انسان ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مخلص اور سیکولر بھی ہیں اور سچے ہی اردو کے عاشق بھی۔ گجرال صاحب وزارت کے کاموں میں بہت مصروف رہنے کے باوجود کمیٹی کے کاموں کو بھی پورا وقت دیتے تھے۔ کمیٹی میں کوئی سفارش کرنے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر غور کرتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کسی کام سے جاتے تو کمیٹی کے جوائنٹ سکریٹری علی جواد زیدی صاحب اور مجھ کو بلا لیتے۔ راستے میں کار میں چلتے ہوئے کمیٹی کی سفارشات پر تبادلہ خیال کرتے۔ وہ علی جواد زیدی صاحب کے فہم و ادراک کے بہت قائل تھے۔ کبھی کبھی میں بھی دبی زبان اور مؤدبانہ انداز میں ان حضرات کی گفتگو میں حصہ لے لیا کرتا تھا۔ گجرال صاحب ایسے موقعوں پر ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے۔ آہستہ آہستہ میں نے گجرال صاحب کے دل میں ایسی جگہ بنا لی کہ بے تکلف ان سے اپنی رائے کا پورا اظہار کرنے لگا۔ گجرال صاحب چونکہ ایک کھلے ذہن کے انسان ہیں اور دوسروں کی رائے کا پورا احترام کرتے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انھوں نے بہت ہی محنت سے تیار کی ہوئی ایک سفارش کمیٹی میں پیش کی لیکن کمیٹی کے ایک دو صاحبان نے اس سے اتفاق نہیں کیا تو ایسے میں سفارش پر بحث شروع ہو جاتی۔ اس بحث کے دوران گجرال صاحب کمیٹی کے چیئرمین یا مرکزی وزیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ کمیٹی کے ایک عام رکن کی حیثیت سے بحث میں حصہ لیتے۔ اور اگر اراکین کی اکثریت اس تجویز میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنا چاہتی تو وہ اس کو بخوشی منظور کر لیتے۔ مجھے گجرال صاحب کے ساتھ تقریباً چار سال تک کام کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران جب گجرال کمیٹی کسی شہر کے دورے پر ہوتی تو ایسے بے شمار موقعے آتے جب صبح سے شام تک مجھے ان کی خدمت میں حاضر رہنے کا موقع ملتا۔ وہ مرکزی وزیر تھے اور میں ایک معمولی سا سرکاری افسر۔ لیکن اسے میں گجرال صاحب کی عظمت ہی کہوں گا کہ انھوں نے مجھے کبھی یہ فرق محسوس نہیں ہونے دیا۔

کمیٹی میں کبھی کبھی بعض معاملوں پر بڑی گرما گرم بحث ہو جاتی۔ خاص طور سے مالک رام صاحب کا لہجہ قدرے تلخ ہو جاتا۔ لیکن گجرال صاحب بڑے سے بڑے وار کو اپنی دلکش مسکراہٹ کی ڈھال پر روک لیتے۔

اردو ادب پر گجرال صاحب کی اچھی نظر ہے۔ ان کے سب سے زیادہ پسندیدہ شاعر علامہ اقبال اور ان کے بعد فیض احمد فیض ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے نظریاتی وابستگی کی وجہ سے سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، مجاز اور ساحر وغیرہ کے بے شمار اشعار انھیں ازبر ہیں جنھیں وہ اکثر اپنی تقریروں میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

جب کمیٹی کی میٹنگ ختم ہو جاتی تھی تو گجرال صاحب اور کمیٹی کے دوسرے اراکین ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ اگر کمیٹی دہلی سے باہر ہوتی تو ادبی گفتگو کا سیشن قدرے طویل ہوتا۔ ابتدا میں تو اس طرح کی گفتگو میں میری حیثیت ایک خاموش سامع کی ہوتی لیکن جیسے جیسے تکلفات کے پردے اٹھتے گئے میں بھی دوسرے اراکین کی طرح اس گفتگو میں حصہ لینے لگا۔

گجرال صاحب کے انگریزی، اردو، ہندی اور پنجابی میں بے شمار مضامین شائع ہوئے ہیں۔ وہ بہت صاف اور سلیس اردو لکھتے ہیں۔ "سیاست" حیدرآباد میں ان کے تقریباً پچاس مضامین شائع ہو

چکے ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات ہیں: ہندوستان کی جدوجہد آزادی، آزادی کے بعد کے مسائل، اردو، مشترکہ تہذیب، ہندوستان پاکستان دوستی، کشمیر اور افغانستان وغیرہ۔ "سیاست" کے ایڈیٹر زاہد علی خان نے مضامین گجرال کے نام سے ان مضامین کا انتخاب کیا تھا۔ کچھ ہی دن بعد پاکستان سے بھی یہ کتاب شائع ہوگئی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام دہلی میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں اس کتاب کی رونمائی ہوئی۔ فروری ۱۹۹۸ء میں ادارہ روزنامہ "سیاست" نے ان کے مضامین کا دوسرا حصہ "مضامین گجرال" کے نام سے شائع کیا۔ ۱۳ جون ۱۹۹۸ء کو عزت مآب کرشن کانت نائب صدر جمہوریہ ہند نے اس کتاب کی رونمائی کی۔ "مضامین گجرال" کے ان دونوں حصوں کے مطالعے کے بعد پڑھنے والا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سیاست میں گجرال صاحب کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف دوسرے لوگوں کی تنقید پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرتے ہیں بلکہ خود اپنی سیاسی جماعت اور اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے صحیح موضوع کا رخ متعین کرتے ہیں۔ گجرال صاحب کے یہ تمام مضامین قومی اور بین الاقوامی سیاست، صحافت، تہذیبی اور تمدنی مسائل جیسے اہم موضوعات پر ہیں۔ انہوں نے اپنی عصری زندگی کے مسائل کا بہت عالمانہ، محققانہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے سیاست کو ذاتی مفاد کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ سیاست کے ذریعے قوم اور ملک کے حالات کو سنوارا جا سکتا ہے۔ گجرال صاحب کو ان سیاستدانوں سے نفرت ہے جو سیاست میں سازباز اور ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔ گجرال صاحب نے نڈر اور بے خوف ہو کر ان سیاستدانوں پر کڑی تنقید کی ہے۔ معاف کیجیے جملۂ معترضہ ذرا طویل ہو گیا۔ اب پھر آتے ہیں گجرال کمیٹی کی طرف۔ کمیٹی نے تین سال کی لگاتار محنت سے اپنی رپورٹ تیار کی۔ آٹھ مئی ۱۹۷۵ء کو یہ رپورٹ وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ چونکہ یہ رپورٹ قاعدے کے مطابق وزارت تعلیم کے سامنے پیش کی جانی تھی۔ اس وقت اندرا جی کے ساتھ مرکزی وزیر تعلیم پروفیسر نورالحسن بھی تشریف رکھتے تھے۔ یہ رپورٹ دو سو انتیس (۲۲۹) صفحات اور ایک سو ستاسی (۱۸۷) سفارشات پر مشتمل تھی۔ چار سال تک یہ رپورٹ سرد خانے میں پڑی رہی۔ اور پھر ۳۰ جنوری ۱۹۷۹ء کو اسے کابینہ کے سامنے پیش کیا گیا اور کچھ دن بعد یعنی ۲۱ فروری ۱۹۷۹ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں یہ رپورٹ پیش کی گئی۔

مرکزی حکومت کی کابینہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو اردو کی ترقی اور اس کا فروغ نہیں چاہتے تھے۔ ان میں کچھ سینئر وزیر تھے جن کی بات کو ٹالنا اندرا جی کے لیے آسان نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گجرال کمیٹی کی سفارشوں پر عمل آوری کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ پارلیمنٹ نے گجرال کمیٹی کی رپورٹ منظور نہیں کی۔ حالانکہ پارلیمنٹ اگر چاہتی تو اس سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ کر سکتی تھی۔ لیکن اس رپورٹ کے بارے میں اتنا کہا گیا کہ چونکہ زیادہ تر سفارشوں کا تعلق ریاستوں سے ہے اس لیے انہیں ریاستی سرکاروں کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ اس کے سلسلے میں اپنے خیالات سے ہمیں مطلع کریں۔ چنانچہ یہ رپورٹ تمام ریاستی سرکاروں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو بھیج دی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایک اہم ترین معاملے کو ٹالنے کا یہ بدترین طریقہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ گجرال صاحب اور کمیٹی کے اراکین نے جس خلوص، محنت اور لگن سے یہ رپورٹ لکھی تھی اسے اس قدر ڈھٹائی کے ساتھ معرض التوا میں ڈال دیا گیا۔ ایسی مثال کم ہی ملے گی کہ پارلیمنٹ کسی اہم مسئلے پر ایک کمیٹی تشکیل دے۔ کمیٹی پورے ہندوستان کا دورہ کر کے سینکڑوں لوگوں سے ملاقات کرے۔ ان کی شکایتیں اور پریشانیاں ریکارڈ کرے اور پھر پارلیمنٹ اس رپورٹ کو اس طرح سرد خانے کی نذر کر دے۔ گجرال کمیٹی کی سفارشیں بھیج دی گئیں اور چونکہ ریاستی حکومتیں مرکزی حکومت کے اشارے کو سمجھتی تھیں اس لیے انہوں نے بھی یہ رپورٹ الماری میں بند کر دی۔ گجرال صاحب کی لگاتار کوششیں بھی اس رپورٹ کو سرد خانے سے باہر نہیں لا سکیں۔

میں سردار جعفری کمیٹی اور دوسری کمیٹیوں کا بھی رکن رہا ہوں۔ ان کمیٹیوں کی ذیلی کمیٹیوں کے رکن کی حیثیت سے وہاں جب بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز سرکاری افسروں سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ بیشتر افسروں نے گجرال کمیٹی کا نام بھی نہیں سنا۔ بعض حضرات نے نام تو سنا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس رپورٹ میں کیا ہے۔ بہار کے ایک اعلیٰ ترین سرکاری ملازم نے سید حامد کمیٹی کی ذیلی کمیٹی کو جس میں میں بھی شامل تھا بتایا کہ انہوں نے پوری رپورٹ پڑھی ہے اور ان کے بیان کے مطابق یہ رپورٹ ہندوستان کی مذہبی اقلیتوں کے بارے میں ہے۔

بعض حضرات کہیں گے کہ ہم پارلیمنٹ کی نیت پر بلاوجہ شبہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ سفارشات دو طرح کی تھیں۔ ایک تو وہ جن پر ریاستوں کو عمل کرنا تھا اور دوسری وہ جنہیں مرکزی حکومت کی وزارتوں کو نافذ کرنا تھا۔ اگر حکومت چاہتی تو اپنے زیر اہتمام ریاستوں اور وزارتوں سے متعلق سفارشوں پر عمل کرا سکتی تھی۔

اب تو خیر ہندوستان کے سیاسی حالات مختلف ہیں لیکن جس زمانے میں یہ رپورٹ پیش کی گئی تھی تو دو تین ریاستوں کو چھوڑ کر ہندوستان کی تمام ریاستوں میں کانگریس کی حکومت تھی اور چونکہ مرکز میں بھی کانگریس کی

حکومت تھی اس لئے مرکز کے لئے ریاستوں سے ان سفارشوں پر عمل کرانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

میری معلومات کے مطابق کسی بھی ریاست نے اس رپورٹ کے سلسلے میں کوئی مثبت جواب دینا تو کجا سرے سے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرکز نے بھی کسی ریاست سے کبھی کوئی جواب طلب نہیں کیا۔ جسٹس آنند نرائن ملا (صدر انجمن ترقی اردو ہند) کی قیادت میں انجمن ترقی اردو (ہند) کا ایک وفد (اس وفد میں میرے علاوہ کرنل بشیر حسین زیدی، مالک رام صاحب اور غالباً ڈاکٹر یوسف خاں شامل تھے) وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملا تھا۔ وفد نے مطالبہ کیا کہ چونکہ کسی ریاست میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا کام شروع نہیں ہوا ہے اس لئے وزیر اعظم کو چاہئے کہ تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی ایک میٹنگ بلا کر اس مسئلے کا حل تلاش کریں۔ اندرا جی کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ بہت جلد اس طرح کی کانفرنس بلائی جائے گی لیکن وہ یہ وعدہ نبھا نہیں کر سکیں۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ انہوں نے اپنے مشیروں سے بات کی ہوگی اور ان میں سے بعض حضرات کی مخالفت کی وجہ سے اس تجویز کو عملی شکل نہیں دی جا سکی۔ اگر ریاستوں نے جواب نہیں دیا تھا تو مرکزی حکومت نے یاددہانی کیوں نہیں کرائی اور بار بار خط لکھ کر ریاستوں کو مجبور کیوں نہیں کیا کہ وہ سفارشات پر عمل کریں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ مرکزی سرکار کی کابینہ کے بعض سینئر اراکین کی اس سلسلے میں نیت صاف نہیں تھی۔ اس رپورٹ کے ساتھ صرف مذاق ہوتا رہا۔ اردو والے مطالبہ کرتے رہے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل کیا جائے۔ جب یہ مطالبہ حد سے زیادہ بڑھ جاتا تو مرکزی حکومت اس سلسلے میں ایک اور کمیٹی تشکیل دے دیتی اور پھر اس نئی کمیٹی کا بھی وہی حشر ہوتا جو اصل رپورٹ کا ہو چکا تھا۔ ۱۴ جون ۱۹۷۹ کو ترقی اردو بورڈ کی میٹنگ میں مرکزی حکومت کی وزارتوں سے متعلق گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا جائزہ لینے کے لئے سرور کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے بڑی محنت سے رپورٹ تیار کی مگر ترقی اردو بورڈ کی یہ تمام محنت بھی بے سود ثابت ہوئی۔ ترقی اردو بورڈ اس کام کے لئے مناسب ادارہ تھا بھی نہیں۔ جب خود مرکزی حکومت لسانی اقلیتوں کے کمشنر اور اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ان سفارشات پر عمل نہیں کرا سکے تو ترقی اردو بورڈ کی کیا حیثیت تھی۔ اس وقت بھی انجمن ترقی اردو نے وزیر تعلیم کو مشورہ دیا تھا کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا کام وزارت تعلیم کو براہ راست کرنا چاہئے لیکن وزیر تعلیم نے ہمارے خط کا جواب بھی دینا مناسب نہیں سمجھا۔ غرض یہ ہے کہ حکومت نے سرور کمیٹی کی رپورٹ کو بھی خاطر میں لانا ضروری نہیں سمجھا۔

جب گجرال کمیٹی کی رپورٹ داخل ہوئے پندرہ سال گزر گئے اور اس کی سفارشات پر عمل نہیں کیا گیا تو اردو والوں نے پھر زور و شور کے ساتھ مطالبہ کرنا شروع کیا کہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کو سرد خانے سے باہر نکالا جائے۔ مرکز میں جنتا دل حکومت اقتدار میں تھی۔ جنتا دل نے اپنے انتخابی منشور میں وعدہ کیا تھا کہ اقتدار میں آنے کے بعد وہ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل کرے گی۔ چنانچہ جب یہ حکومت اقتدار میں آئی تو گجرال صاحب کے اصرار پر گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا جائزہ لینے کے لئے ۱۵ فروری ۱۹۹۰ء کو ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی جو سردار جعفری کمیٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد سید حامد کمیٹی اور پھر مادھو راؤ سندھیا صاحب کی صدارت میں ایک نگراں کمیٹی بنائی۔ ان تمام کمیٹیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اب شمالی ہند اور خاص طور سے اتر پردیش میں اردو کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ خراب ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ایک وفد جناب آئی۔ کے۔ گجرال سے ۱۹۹۲ء میں اس وقت ملا تھا جب وہ وزیر خارجہ تھے۔ وفد نے گجرال صاحب کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ گجرال کمیٹی کی تمام سفارشات پر فوری طور پر عمل کیا جائے۔ گجرال صاحب نے کہا کہ فی الحال حکومت کے لئے تمام سفارشات پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ کچھ ایسی اہم سفارشات بتائیے جن پر فوری طور پر عمل کیا جا سکے۔ کچھ ہی دن کے بعد آئی۔ کے۔ گجرال صاحب ہندوستان کے وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ وزیر اعظم بننے کے بعد انہوں نے راقم الحروف کو خط لکھا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) گجرال کمیٹی کی کچھ ایسی سفارشات کی نشان دہی کر دے جن پر فوری عمل کرنا ممکن ہو۔ انجمن نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں انجمن کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جناب سید حامد، جناب م۔ افضل (سابق ممبر پارلیمنٹ)، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب سید مظفر حسین برنی، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر شمیم حنفی اور خلیق انجم شامل تھے۔ کمیٹی نے ایک میمورنڈم تیار کیا جس میں گجرال کمیٹی کی ایسی سفارشات کی نشان دہی کی گئی جن پر فوری عمل کیا جا سکتا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے وفد نے ۲۱ نومبر ۱۹۹۷ء کو یہ میمورنڈم وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ وزیر اعظم نے اس موقع پر اردو کے بہت سے پروفیسروں اور دانشوروں کو بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ "حق دنیا" اور "عوام" کے ایڈیٹر جناب شاہد صدیقی نے بھی ایک میمورنڈم پیش کیا۔ وزیر اعظم کے ساتھ میٹنگ لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے رہی۔ میٹنگ کے شروع میں وزیر اعظم نے کہا کہ گجرال کمیٹی کی تمام سفارشات پر عمل کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ سفارشات کا بہت سا حصہ وہ ہے جن پر ریاستی حکومتوں کو عمل کرنا ہے۔ میٹنگ میں مندرجہ ذیل فیصلے ہوئے۔ وزیر اعظم نے یقین دلایا کہ حکومت ان فیصلوں

پر عمل کرے گی۔ نیز اس میٹنگ کے تمام فیصلوں کو گزٹ کیا جائے تاکہ حکومت ان فیصلوں کی پابند ہو سکے۔ فیصلے حسب ذیل تھے:

۱۔ گجرال کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ جن علاقوں میں اُردو بولنے والے دس فی صدی ہیں وہاں ایک اردو میڈیم پرائمری اسکول قائم کیا جائے گا اور ہر ۸ یا ۱۰ پرائمری اسکول پر ایک اردو میڈیم سکنڈری اسکول قائم کیا جائے گا۔

۲۔ وزیر اعظم نے کہا کہ مولانا آزاد نیشنل اوپن یونیورسٹی کا قیام اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے ایک بہت بڑا قدم ہے اس میں طلبہ کہاں سے آئیں گے اور کیسے آئیں گے اس کے لئے بنیادی کام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو کرنا ہوگا۔

۳۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کا مطالبہ تھا کہ سہ لسانی فارمولہ پر گجرال کمیٹی کی سفارش کے مطابق عمل کیا جائے۔

اس میٹنگ میں وزارت فروغ انسانی وسائل کے وزیر ایس آر بومئی صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ ریاستی حکومتوں کو اس سلسلے میں خط لکھا جا چکا ہے اور اُن سے کہا گیا ہے کہ وہ نومبر ۱۹۹۷ء کے آخر تک سہ لسانی فارمولہ کے بارے میں اپنی رائے لکھ کر بھیج دیں تاکہ حکومت اس کی روشنی میں لائحۂ عمل طے کر سکے۔ یہ مدت گزر چکی ہے مگر افسوس ہے کہ ابھی تک مرکزی حکومت نے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔

۴۔ یہ بھی طے پایا کہ جدید زبان کی حیثیت سے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں اُردو تعلیم کا انتظام کیا جائے گا اور اس سلسلے میں وزارت فروغ انسانی وسائل ہندوستان کی تمام ریاستوں کے وزرائے تعلیم اور سکریٹریوں کی ایک میٹنگ بلائے گی تاکہ اس فیصلے کی عمل آوری پر غور کیا جا سکے۔

۵۔ یہ بھی طے پایا کہ جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی مطلوبہ تعداد موجود ہے وہاں اردو کے میدان میں کام کرنے والی رضا کار تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور کوشش کی جائے گی کہ وہاں یہ تنظیمیں اُردو میڈیم پرائمری اور سکنڈری اسکول چلائیں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ان اداروں کو مضبوط کرنے کے لئے مالی تعاون دے۔

۶۔ یہ بھی طے پایا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو اساتذہ کی تربیت کا معقول انتظام کرے گی اور اردو کی ماڈل نصابی کتابیں ترتیب دے گی۔

۷۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے میمورنڈم میں شکایت کی تھی کہ انجمن پچھلے پچاس سال سے مرکزی اور صوبائی حکومت کے مختلف محکموں سے اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی شکایتیں کرتی رہی ہے لیکن ان محکموں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ یہ بہت اہم شکایت ہے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو چاہئے کہ اُردو میدان میں کام کرنے والی کچھ اہم شخصیتوں کو پورے ہندوستان سے بلائے' ان میں انجمن ترقی اردو کے مرکز اور شاخوں کے نمائندے بھی شامل ہوں۔ وہ اس مسئلے پر غور کریں۔

۸۔ اس سلسلے میں یہ بھی طے پایا کہ انجمن ترقی اردو ایک ایسی نگراں کمیٹی کا کام کرے گی جو اُردو کی ترقی اور فروغ کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتی رہے گی اور ہر سال اس کی رپورٹ تیار کر کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت فروغ انسانی وسائل اور متعلقہ ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھیجے گی۔

۹۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے شکایت کی تھی کہ دوردرشن اور حکومت کے بہت سے دفتروں میں اردو کی آسامیاں خالی ہیں۔ طے پایا کہ پوری کوشش کی جائے گی کہ ان آسامیوں کو پُر کیا جائے۔

۱۰۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے اپنے میمورنڈم میں مطالبہ کیا تھا کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا جائزہ لینے کے لئے ایک قومی سطح کی نگراں کمیٹی قائم کی جائے۔ طے پایا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان فوراً یہ نگراں کمیٹی تشکیل دے اور اس میں انجمن کے نمائندوں کو بھی شامل کرے۔

۱۱۔ یہ بھی طے پایا کہ مرکزی حکومت جب بھی اُردو کے سلسلے میں کوئی کمیٹی تشکیل دے گی اس میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان اور انجمن ترقی اردو (ہند) کو بھی شامل کرے گی۔

۱۲۔ وزیر اعظم نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذمہ داروں کو ہدایت دی کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر ایک کل ہند اردو کانفرنس منعقد کرے۔

۱۳۔ یہ بھی طے پایا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہندوستان کی ایسی تمام اُردو تنظیموں کو اس طرح منظم کرے کہ وہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے بنیادی کام کر سکیں۔

گجرال صاحب کی اس قدر پرجوش اور پرخلوص کاوشات کے باوجود ہنوز ہندوستان میں اردو زبان کا مسئلہ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔

لبِ شیریں

وقار جاوید

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں جمہوری نظام کے استحکام کی خاطر آپ نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اس کے لئے برطانوی حکومت آپ کو سلام کرتی ہے۔ جنوبی ایشیا میں ترقی اور استحکام قائم کرنے کے لئے آپ کے نظریے نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ بھی قابل ستائش ہیں۔ اس کے لئے بھی مبارکباد!

ٹونی بلیئر

آپ نے ذاتی طور پر فرانس اور ہندوستان کے مفادات کی خاطر دوستی اور اشتراک کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے اس کے لئے میں آپ کو مخلصانہ تعاون کی تجدید کے ساتھ یہ یقین بھی دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔

لیونل جوسپین

پچھلے برسوں کے دوران ہندوستان کو بین الاقوامی برادری میں ایک معزز مقام حاصل ہوا ہے۔ آپ کے نظریہ خارجہ پالیسی جو آپ ہی کے نام سے منسوب ہے کے ذریعے ٹھوس نتائج حاصل ہونے کے ساتھ جنوبی ایشیا کے کروڑوں عوام کے دلوں میں ایک بہتر مستقبل کی امید پیدا ہوئی ہے۔ برصغیر میں پڑوسی ممالک سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی ایک تحریک چل پڑی ہے جس کا تمام تر سہرا آپ کے سر ہے۔

ای۔ پریماکوف

آپ یقین جانئے بحیثیت وزیر اعظم ہند آپ نے ایک ورثہ چھوڑا ہے جس کی بازگشت دنیا بھر کی آئندہ نسلوں کے دل و دماغ کو ایک مدت تک گرماتی رہے گی۔ اور جس کی حکومت اور عوام ہمیشہ آپ کے خیر مقدم کے لئے پرجوش رہیں گی۔

ڈاکٹر نوین چندر رام غلام

گجرال صاحب کے دل میں خلوص ہے۔ طبیعت سے شریف اور ملنسار ہیں۔ ان سے ایک بار مل کر دوسری بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ تقریر عمدہ اور دلنشین کرتے ہیں۔ استدلال کا طریقہ دلپذیر ہے۔ بذلہ سنج اور حاضر جواب ایسے کہ آپ پکار اٹھیں:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوا

خوشتر گرامی

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں آپ محسوس بہت کرتے ہیں لیکن جب ان کے بارے میں احساسات کے اظہار کا موقع درپیش ہوتا ہے تو الفاظ اُن احساسات کو چھونے کے اہل نظر نہیں آتے۔ فراق کو رکھپوری نے کہا تھا۔

؎ خود اپنے خیالوں کو عدم میں ہاتھ لگانے سے ڈرتا ہوں

مجتبیٰ حسین

یہ سچ ہے کہ آئی۔ کے۔ گجرال اسی ملک اور معاشرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ غیر منقسم ہندوستان اور بٹے ہوئے ہندوستان کی درمیانی کڑی ہیں جو ماضی سے چل کے حال میں رک کے مستقبل کی طرف قدم بڑھانے کا حوصلہ اور ظرف رکھتے ہیں۔ اُن کی فکر صاف اور سیدھی ہے۔ انہوں نے پانچ دریاؤں کا پانی پیا ہے اس لئے اُن کی روح سیراب اور شاداب ہے۔

سلمیٰ صدیقی

جو شخص بھی گجرال صاحب کا نام لیتا ہے ہمارے گجرال صاحب کہہ کر لیتا ہے۔ گجرال صاحب جمالیات کے آدمی ہیں۔ ادیب ہیں سخن شناس ہیں اور وزیر اعظم کے عہدہ جلیلہ و جلیلہ پر فائز ہونے کے باوجود ان کے چہرہ کا معصومانہ اور مشفقانہ تبسم اسی طرح برقرار ہے۔

یوسف ناظم

جناب آئی۔ کے۔ گجرال صاحب ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ کا ایک اہم نام ہیں۔ مجاہد آزادی کے علاوہ ایک ادیب، مفکر، باضمیر اور ہوش مند سیاستدان ہونے کے ساتھ ادب دوستی اور انسان دوستی کے عناصر ان کی فطرت کے بنیادی اوصاف ہیں۔

علی احمد فاطمی

گجرال صاحب کی ذات میں بہت سی خوبیاں پنہاں ہیں۔ انتہائی ضبط و برداشت سے کام لے کر سب کو اپنا ہم قدم و ہم خیال بنانے میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ تھوڑے عرصہ میں خارجہ پالیسی، انشی تحقیقی اطر معاہدہ سے لے کر پاکستان کے ساتھ تعلقات جیسے مسائل سے بخوبی نمٹنے سے ملتا ہے۔

نیرجا چودھری

گجرال صاحب سے پہلی ملاقات "گجرال کمیٹی برائے فروغ اردو" کے موقع پر ہوئی اس کے بعد گجرال صاحب سے میری اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ ادبی جلسوں میں اُن کی تقاریر سنیں جس سے اُن کی عالمانہ بصیرت سے روشناس ہوا۔ انڈو پاک مشاعروں کی صدارت کرتے ہوئے بھی انہیں قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ غرض گجرال صاحب کی شخصیت ایک بھرپور شخصیت ہے جس کے اتنے روشن پہلو ہیں کہ اُن کی تابانی چند لمحوں کی ملاقات میں بھی دل و دماغ کو پُرنور کر دیتی ہے۔

کشمیری لال ذاکر

اندر کمار گجرال پاکستان اور ہندوستان کے مابین ایک نئی فکر اور سوچ کے علمبردار ہیں جس کے تحت دونوں ممالک میں باہمی کشیدگی کو کم کر کے دوستانہ تعلقات استوار کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ وہ ہندوستان کے صاحب فکر طبقے کے ممتاز و محترم نمائندے ہیں۔

شفیع ایم انعام

سیاسی، تہذیبی اور علمی مسائل پر گجرال صاحب کی رائے اکیسویں صدی کے ہندوستان کا پیام ہے۔ انہوں نے نئی فکر کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ تھنک ٹینک کا مقام رکھتی ہیں۔ گجرال صاحب کے مضامین اردو، انگریزی، ہندی اور پنجابی اخبارات اور رسائل میں نصف صدی سے زائد عرصہ سے شائع ہو رہے ہیں۔ انہوں نے جن اہم مسائل پر قلم اٹھایا ہے وہ عصر حاضر کی تاریخ کے اہم باب کہے جا سکتے ہیں جو مسائل کے حل کے لئے آج بھی دعوت فکر دے رہے ہیں۔

زاہد علی خان

پروردگار کی رحمت سے یہ عاجز اردو، ہندی، گورمکھی اور انگریزی زبان و ادب میں شدبد رکھنے کے باوجود یہ بات اعتماد و وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ مذکورہ زبانوں کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی ایسے الفاظ دستیاب نہیں ہوئے جو اندر کمار گجرال صاحب کی عظمت، تدبر، تحمل اور دوراندیشی کو اپنے اندر سمو سکے اور ان کے دل میں چھپے انسانیت کے درد و کرب کی ترجمانی صحیح طور پر ادا کر سکے۔

ڈاکٹر کیول دھیر

بھائی جان کے بعد بھی محترم گجرال صاحب اسی طرح ہمارے محسن اور کرم فرما ہیں جس طرح بھائی جان کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ میں جب بھی ان سے ملتی ہوں وہ ہمیشہ کہتے ہیں۔ "میں تمہارا ساتھ ہوں، کسی بات کی فکر نہ کرنا۔"

سرور شفیع

(ہمشیرہ ساحر لدھیانوی)

صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ حکومت ہند اور کارپردازان ہند سے ایک پاکستانی شہری اور قلمکار کے ناطے کبھی بھی مجھے کسی طرح کی خوش امیدی پالنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی مگر جب جب محترم اندر کمار گجرال صاحب کی محبت و مروت سے سرشار ہونے کا موقع ملا ہے تب تب دل میں اپنے مستحکم فیصلے کی بابت نظر ثانی پر دل ضرور مچلا ہے کہ جس ملک کو اندر کمار گجرال جیسا شفاف دل، شفاف نظر اور شفاف دماغ دانشور رہنما میسر ہو اس کی بابت ہر صاحب دل کو ایک نہ ایک دیا ضرور روشن رکھنا چاہئے۔

سید ضمیر جعفری

قصۂ غم کی انتہا کر دوں
ہر طرف حشر سا بپا کر دوں
میرے دل میں جو قلزمِ غم ہے
اس سے تجھکو آشنا کر دوں

(تشنہ)

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر یوگیندر پال تشنہ

کے نام

براہِ راست

ادارہ "چہارسُو" کی جانب سے "قرطاسِ اعزاز" کا منشا و مقصود' اپنے عصر کے قدآور اہلِ قلم کی ہمہ جہتی کو ایک جلد میں محفوظ کر کے موجودہ اور آنے والے وقتوں کے لئے تحقیق و جستجو کے باب کو معتبر و باوقار بنانے کی ایک ادنیٰ کاوش ہے جس میں کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ وقت کا منصف بروقت اور ضرور انجام دے گا۔ کبھی کبھی کسی بے نیاز و باکمال مجاہدِ اُردو کی خدمات دیکھ کر اس قدر حیرت و استعجاب ہوتا ہے کہ دل اہلِ اردو سے اس نادر و نایاب تخلیق کار کو متعارف کرانے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے! ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ ہمارے خیال میں اُردو زبان و ادب کے ایسے مخلص' باادب' بے نیاز اور باہُنر فنکار ہیں جن کا قلمی برادری سے براہِ راست اور بھرپور تعارف ہونا اُسی قدر ضروری ہے جس قدر زندگی کا سانسوں سے ہوا کرتا ہے!! پسند و ناپسند' کامیابی و ناکامیابی کا آئینہ ہمیشہ کی مانند ابھی بھی آپ کے اختیار میں ہے جس کے اندر اپنا چہرہ دیکھنے سے' کبھی بھی ہمیں خوف نہیں آتا!!!

گلزار جاوید

☆ آپ کی پیدائش کی نسبت' نوشہرہ اور سیالکوٹ میں کس مقام کو درست گردانا جائے؟

☆☆ ۱۷ نومبر ۱۹۱۹ء نوشہرہ' ضلع پشاور درست ہے۔

☆ ایک چیز پُرانے وقتوں میں شجرۂ نسب ہوا کرتی تھی۔ بارِ خاطر نہ ہو تو آپ بھی خاندانی بزرگوں کے آبائی تعلق اور روز و شب سے ہمارے قاری کو آگاہ فرمایئے؟

☆☆ یوگیندر سنگھ بہل نام' تخلص تشنہؔ' ولد سردار سنت سنگھ بہل فانی تخلص۔ سنتے ہیں بزرگوں سے کہ ان کے بزرگ کشمیر کے راجہ کے دربار میں کرسی نشین ہوا کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں انہیں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اور ہم جاگیردار کہلانے لگے۔ اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں کہ ہمارے بزرگ اور کیا تھے۔ کیونکہ ایئر فورس کی ملازمت میں اس جانب میرا دھیان گیا ہی نہیں۔ اور یا کہنا Eat, Drink and Be Merry پر ہی عمل درآمد رہا۔ بیوی سدرشٹ بہل مرحوم۔ میرے تین بچے ہیں' دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ بڑی بیٹی نوتن ایم اے انگلش اور ایم بی اے دہلی میں۔ چھوٹی بیٹی انجو بی اے اور ایم بی اے دہلی میں۔ چھوٹا بیٹا ہرش بی ایس سی' ایم بی اے اور کمپیوٹر انجینئر امریکہ میں ہے۔

☆ تعلیم کب کب کہاں کہاں اور کس درجہ تک حاصل کی اور آپ کی پسند کے مضامین کیا ہیں؟

☆☆ میری اُردو کی تعلیم تو مڈل تک ہی ہے۔ میٹرک میں سائنس کی جانب رجوع کیا اور بی ایس سی میں بھی اُردو سے تعلق نہ رہا۔ البتہ ایئر فورس کی ملازمت میں جب میری پوسٹنگ پالم دہلی میں ہو گئی تو میں نے ادبِ عالم کے لئے مطالعہ کیا۔ جس میں حالی کی مسدس' غالب اور چشتی آزاد وغیرہ مطالعے میں رہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جن کی تعلیم بوجہ نقلِ وطن نامکمل رہی اُن کو پنجاب یونیورسٹی نے ایم ایس سی میں داخلے کی اجازت دے دی تھی اور پھر ایریانکل انجینئرنگ اور پائلٹ جس میں موسم اور نیوی گیشن ایئر فورس کی ملازمت میں حاصل کی انسٹرکٹر بھی رہا اور ایک کتاب انگریزی میں A simple study of Aeroplan Engines پر لکھی جو کہ آٹھ سو صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کو چھپوانے کی اجازت Rolls Royle England نے تو دے دی مگر گورنمنٹ سے نہ مل سکی کیونکہ اس میں فائٹر ہوائی جہازوں کا مواد بھی شامل تھا اور بعد ازاں AME حاصل کی جس کے لئے میں سول میں ہوائی انجن کی inspection کر سکتا تھا۔ 1961ء کے آخر میں میں نے از خود ملازمت سے علیحدگی حاصل کر لی اور بزنس مینجمنٹ میں ڈپلومہ لندن سے کیا اور پھر Pennsyluania Poedue Universities (USA) سے پیسٹ کنٹرول ٹیکنالوجی کے لئے پڑھائی کی اور فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے FRI بھی اور اب ہربل میں ڈپلومہ اور الٹرنیٹو میڈیسن (Diploma in Herbal and Alternative medicines) اور انٹامولوجی میں Fellow in Entomological Society of India اور Entomological Society of America سے بھی اسی طرح مطالعہ میری زندگی میں ہر قدم پر ہمرکاب رہا اور شاید اسی طرح دمِ آخر تک سلسلہ جاری رہے۔

☆ شعری مزاج کب اور کس سبب آشکار ہوا' کس ماحول اور کس کی زیرِ نگرانی ابتدائی مراحل طے کئے؟

☆☆ 1938ء میں میں نے پہلی نظم کہی جو کہ نئے سال پر تھی اور دوسری بسنت کے تہوار پر۔ اس وقت ہمارے ماسٹر کرتار سنگھ ہوتے تھے۔ پھر

1943ء میں ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا اور اس پر چند نظمیں اور کچھ غزلیں کہیں۔ مگر شائع نہیں ہوئیں بعد ازاں 1944ء میں میری نظمیں اور لطیف پارے صدائے عامہ ویکلی پشاور میں چھپنے لگے۔

ایئر فورس میں میرے ایک دوست ساتھی جگدیش لعل گوسائیں سے ملاقات ہوئی جو کہ بہت اچھے شاعر تھے۔ جن کے توسط سے شاعری میں نکھار آتا چلا گیا کیونکہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور اردو، عربی اور فارسی پر انہیں عبور حاصل تھا اور مطالعہ بھی کافی وسیع تھا۔ وہ مجھے پیار سے شاعری کے بارے میں سمجھایا کرتے اصلاح اور مشورے دیا کرتے بعد ازاں میرے دوست عشرت قادری سے ملاقات ہوئی اور اصلاح کا سلسلہ آج دن تک بھی جاری ہے۔ کوئی کمی بیشی نہیں محسوس ہوتی۔ اور اس طرح آج تک یہ سفر طے کر رہا ہوں۔ اس میں میرے دوست اندر روپ دت نادان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔

☆ تقسیم کے بعد کلام اشاعت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اور کن کن جرائد میں شامل اشاعت رہے؟ اور اہل خانہ کا ردعمل کس طرح کا تھا؟

☆☆ 1944ء سے اشاعت کا سلسلہ چلنے لگا تھا اور میرے افسانے چترا ویکلی لاہور، پارس ویکلی مشہور دہلی، ملاپ، شعلہ و شبنم، راہی، ہمایوں، کاروان ادب، مستانہ جوگی، توازن، ندیم وغیرہ وغیرہ میں شائع ہوتے رہے اور کلام بھی اسی طرح کئی جرائد میں چھپتا رہا مثلاً انتساب، آجکل، توازن وغیرہ۔

☆ قارئین نے آپ کی بابت کس رویے کا مظاہرہ کیا اور آپ نے اس کے کیا اثرات قبول کئے؟

☆☆ قارئین کا میرے بارے میں رویہ مناسب ہی رہا اور میں اپنی روش پر چلتا رہا۔ کیونکہ صلے اور ستائش کا کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا کیونکہ میرا مقصد تو اپنی تخلیق کی "خوشی" کو پورا کرنا ہوتا تھا اور ہر طرح سے اپنے احساس و جذبات کی ترجمانی کر لیتا تھا۔ کیونکہ میرا مقصد تو حالات جو میرے دل پر اثر انداز ہوتے رہتے تھے ان کو قلمبند کرنا ہوتا تھا کوئی برا سمجھا یا بھلا سمجھا اس کا اثر مجھ پر کبھی نہیں ہوا۔ ہاں اتنا ضرور ہے مجھے کبھی ناپسند نہیں کیا گیا۔ کیونکہ میری حتی الامکان یہی کوشش رہی ہے کہ کسی کا میری جانب سے دل نہ دکھے اور رنجش پیدا نہ ہو۔ اور ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، میرے قریبی احباب میں سے ہیں۔ اور مرحوم ڈاکٹر کامل قریشی، ذہین نقوی، دلیپ بادل، حبیب خان، اندر روپ دت نادان میرے بہی خواہوں میں تھے۔ اور مجھے فیض پہنچانے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ البتہ جہاں پیار ہوتا ہو وہاں تنازع تو اکثر ہو ہی جاتا ہے قدرتی بات ہے مگر اس کی میعاد چند گھنٹوں سے زائد کبھی نہیں رہی اور وہ اس لئے بھی کہ میں نے ہمیشہ یہی خیال رکھا ہے کہ زندگی اس قدر مختصر ہے اس میں ناراضگی کی گنجائش کہاں اور اس خیال کے آتے ہی میں نے ناراضگی فوراً ترک کر دی۔ اور یہی میرے مرحوم دوست خاص علی خان کا بھی کہنا تھا کہ بہت زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتا۔ اس لئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں میرے دوست ہو سکتا ہے کم ہوں مگر میرا دشمن یا میرا نہ چاہنے والا کوئی نہیں ہے کیونکہ میں نے زندگی بھر یہی کوشش کی ہے کہ میں کسی کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ اس بات کو میرے عزیز دوست مدن لعل گلاٹی بھی اکثر سراہتے ہیں کہ میں ہنسی خوشی زندگی گزارنے کا قائل ہوں۔ غم کی اگر گھڑی آئی بھی ہے تو چار چھ غزلیں یا نظمیں کہہ ڈالیں اور پھر نو بہ نو ہو گئے۔ ہاں مگر عشق و محبت کی حیثیت اور اس کا درد تو دم آخر تک ساتھ نبھائے گا۔ یہی تو ایک درد ہے جو بے حد عزیز لگتا ہے جس سے گاہے بگاہے میں شاعری میں کام لیتا ہوں۔

☆ آپ کے خیال میں تخلیق کے لئے تنقید کی کیا اہمیت ہے نیز کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا کلام مناسب طریق پر ناقدین نے جانچا، پرکھا اور بے لاگ رائے سے نوازا ہے؟

☆☆ صحت مند تنقید تو ادب کے لئے ضروری ہے اسی کے سہارے شاعر و ادیب اپنے کلام اور ادب کو سنوارتے ہیں اور نکھارتے ہیں اور یہی ان کو آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ناقدین کا میرے افسانوں اور کلام کے بارے میں رویہ اچھا ہی رہا ہے اور مجھے کبھی ان سے گلہ یا شکایت نہیں رہی۔

☆ افسانہ سے آپ کی مڈبھیڑ کب اور کہاں ہوئی اور آپ نے افسانوی چلن کو کس طور نبھایا، مثلاً ہم آپ کے اہل خانہ، احباب اور ناقدین ادب کے رویے سے آگاہی کے طالب ہیں؟

☆☆ گلزار بھائی! بالکل یاد نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ جب ایئر فورس کی ملازمت میں اندر روپ دت نادان سے ملا تو وہ افسانے لکھا کرتے تھے۔ انہیں دنوں میں نے بھی افسانے لکھنے شروع کئے تھے۔ وہ بھی پہلے شاعری نہیں کرتے تھے صرف افسانے ہی لکھتے تھے اور میں بھی اور ایک دوسرے کو سنا کر پھر چھپنے کے لئے بھجوا دیتے تھے۔ شاید اسی طرح مڈبھیڑ ہوئی ہوگی۔ آغاز میں دو چار افسانے ایسے لکھے تھے جن کا اصل زندگی سے کچھ تعلق نہیں تھا مگر بعد ازاں ہر افسانہ کسی نہ کسی حادثے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے اگر آپ لوگ مجھے حادثاتی افسانہ نگار یا نظم یا غزل کہنے والا سمجھتے ہیں تو دریں چہ شک است۔ ملازمت کے بعد افسانے لکھنے بہت کم کر دیئے کہ وقت کی گنجائش نہیں تھی کہ توجہ دیتا اور پھر زیادہ لکھنے سے بھی اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ لکھتے لکھتے کاروبار کی جانب دھیان چلا جاتا اور افسانہ ادھورا ہی رہ جاتا تھا۔ اس لئے نظم یا غزل کہنے پر ہی اکتفا کرتا رہا ہوں۔ البتہ اگر

حادثے نے مجبور ہی کر دیا تو پھر قلم سچ کاغذ پر سفر کرنے لگتا تھا اور قریب قریب ایک دو sittings میں افسانہ مکمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ احباب، دوست یا تو سراہتے تھے مگر اہلِ خانہ ہمیشہ ناپسند کرتے تھے کیونکہ بعد ازاں اُن کو بُرا نہیں لگتا تھا مگر اچھا ہرگز نہیں سمجھا کہ میں صاف صاف سب کو رگڑ دیتا تھا۔

☆ کچھ لوگ آپ کو نظم کے شاعر کے طور پر ہی یاد کرتے ہیں جب کہ غزل بھی آپ کی محبوب صنفِ سخن ہے؟

☆☆ میں دونوں صنفوں میں ہی کہتا ہوں تو اُس خیال پر منحصر ہے کہ غزل ہو جائے یا پھر نظم یہ میں از خود طے نہیں کر پاتا کیونکہ یہ سب کچھ تو عالمِ از خود رفتگی میں ہی ہو جاتا ہے۔ میں نے کبھی شعر کہنے کے لئے قلم نہیں اٹھایا۔ بلکہ کئی مرتبہ تو اخبار پڑھتے پڑھتے نظم یا غزل کہنا شروع کر دیتا ہوں اور اخبار دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ مگر قلم اور عینک بیت الخلا میں بھی ساتھ رکھتا ہوں۔ خدا خبر کب بجلی کوند جائے اور میرا اختیار میرے پاس ہو۔ اب دیکھئے نا۔ پیاس کے صحرا کی وحشی غزل نما... دعائے خیر۔

میں بندہ تو ہوں خدا لا الٰہ الا اللہ

مجھے بھی اپنا بنا لا الٰہ الا اللہ

اور فن تک اسی طرح مسلسل چلی جاتی ہے۔

☆ بہت سے احباب آپ کو حادثاتی یا زیادہ سے زیادہ اپنوں کی جدائی کے نوحاتی شاعر تک کیوں محدود کرتے ہیں؟

☆☆ گلزار بھائی یہ ایک ایسا خوبصورت سوال ہے جس کی میں وضاحت کرنا چاہوں گا۔ یقیناً میں نے حادثات پر ہی لکھا ہے اور میرا پہلا افسانوں کا مجموعہ جس کا نام تھا "موجِ حوادث" جس کی ایک کاپی بھی میرے پاس نہیں۔ اور اسی طرح بہت ساری کتب یعنی ہزاروں کی تعداد میں یہ مجبوری کاروبار اِدھر اُدھر ہو گئیں کیونکہ ملازمت سے الگ ہو کر کاروبار میں بڑی جدوجہد کرنا پڑی اور کتب کی جانب خیال تک نہ آیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے حادثات پر ہی لکھا ہے جیسے اپنوں سے جدائی کا غم کیونکہ میں نے زندگی میں جس کو بھی چاہا ٹوٹ کر چاہا۔ وقت گزاری کے لئے نہیں۔ میں نے کبھی دوست احباب کا بڑا سلسلہ نہیں رکھا۔ محبت کرنا ہی میری زندگی کا مقصد رہا ہے البتہ عشق کی راہ کا مسافر بدلا نہیں اور بھولا بھی نہیں۔ اس لئے کسی سے جدائی کا غم اور اس کی قربت مجھ پر ہمیشہ حاوی رہیں۔ اخبار میں بھی کبھی کچھ ایسی خبر پڑھ لیتا ہوں تو مجھ سے کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ جس کے تعلق سے آپ نے میری نظم 11 ستمبر اور گجرات کے حادثے سے متاثر ہو کر پڑھی ہوگی۔ میں نے شعر لکھنے کے لئے شاعری نہیں کی بلکہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اشعار قلم کی زد میں آتے گئے اور صفحۂ قرطاس پر بکھرتے چلے گئے۔ جن پر میرا بس نہیں چلتا۔ الفاظ کی تراش خراش بھی کچھ زیادہ نہیں کی اس لئے حق بجانب ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ میں حادثاتی اور اپنوں کی جدائی کے غم میں لکھتا ہوں۔

اب یہی دیکھ لیجئے اپنے ایک عزیز دوست ضامن علی خان کی جدائی کے غم میں میں نے ایک طویل نظم "نور کی وادی" کہہ ڈالی اور اُس پر مزید غزلیں اور اشعار اس لئے میں زیادہ تر جذبات سے کام لیتا ہوں۔

☆ اچھا یہ فرمائیے! تقسیم کے ردِعمل میں تحریر کئے گئے ادب میں مغربی پنجاب سے ہجرت کرنے والوں کے ہاں جو شدتِ کرب نمایاں ہے وہ آپ کے ہاں اس قدر نمایاں کیوں نہ ہو سکی؟

☆☆ تقسیمِ ہند کا اثر مجھ پر اس قدر نہ ہو سکا کیونکہ میں ایئر فورس کی ملازمت میں تھا اور تقسیم سے بہت پہلے چھٹیوں پر سب لوگ دہلی آ گئے تھے ماسوا والد بزرگوار کے جو کہ پشاور میں رہ گئے کیونکہ وہ ٹرانسپورٹ کا بزنس کرتے تھے اور اُن کا بے شمار روپیہ وہاں رہ گیا تھا جو کبھی انہیں نہیں مل سکا اور بمشکل تمام میں نے ہوائی جہاز کے ذریعے انہیں دہلی بلوایا۔ جو کہ ایئر فورس کا ہوائی جہاز تھا۔ اُن کی داستان بھی میں نے نہیں سنی کیونکہ میں اُس وقت مدراس میں تھا اور ہر کسی کی چھٹی کینسل کر دی گئی تھی اور جب ہم بہت سالوں بعد ملے تو کہانی کا اثر بہت حد تک زائل ہو چکا تھا۔ البتہ کرشن چندر کا "ہم سب وحشی ہیں" پڑھا اور جوش ملیح آبادی کی نظم ہندوستان پاکستان کا نعرہ بھی پڑھی اور محسوس کر رہ گیا اور جلد ہی ایئر فورس کی گہما گہمی میں گم ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ ایئر فورس میں انگریزی کا چلن بہت زیادہ تھا اور اردو ہندی بولنے کا رواج نہیں تھا۔ اُردو بولنے میں دشواری ہونے لگی اور گفتگو میں بہت سارے الفاظ انگریزی کے ہی استعمال کرتے رہے۔ اس طرح میری اُردو کی vocabulary بھی کمزور پڑتی گئی مگر جو کچھ بھی پڑھا اس کا دل پر بہت اثر ہوا۔ اسی زمانے میں 1947ء کا بہترین ادب بھی دہلی سے شائع ہوا جس میں بہت ساری تخلیقیں نقلِ وطن کے درد سے بھری تھیں۔

☆ ایک وضاحت یہ بھی فرمائیے کہ آپ نے ملازمت سے فراغت کے بعد شاعری کو باقاعدہ کیوں اپنایا؟

☆☆ میں دورانِ ملازمت شاعری بھی کرتا رہا اور افسانے بھی لکھتا رہا کیونکہ ملازمت میں وقت بہت ملتا تھا۔ کیونکہ صبح چھ بجے کام پر جاتا اور بارہ بجے ایک بجے کام سے لوٹ آتا پھر فرصت ہی فرصت رہتی۔ اس لئے دورانِ ملازمت شاعری کرتا اور افسانے لکھتا جاری رہے۔ البتہ جب ملازمت ترک کر دی تو کاروبار جمانے کے لئے بہت تگ و دو کرنا پڑا جس کی وجہ سے بہت دنوں تک یہ مشغلہ نہ رہا اور روٹی دال کے چکر میں کوشاں رہا۔ مگر پھر بھی گاہے گاہے قلم چلتا رہا کیونکہ دل کی آواز کو روکنا تو بس کی بات نہ تھی اور

ـلی تھی جس کی کوئی خاص یا دلچسپ وجہ تھی بس جی چاہا کہ اب کچھ اور کرنا چاہیئے ۔میری صحت کا راز صرف یہی ہے کہ میں ہر حال میں خوش رہتا ہوں۔ ملازمت میں بھی اور بعد از ملازمت کھانے میں سادگی ضرور رکھتا ہوں اور ایک ایسا کھانا' جو کہ درمیانہ طبقہ کے لوگ بہ آسانی جاری رکھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں خوش مزاجی بھی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔اب یہی دیکھ لیجئے مجھے کئی سالوں سے دل کا مرض ہے مگر میں پرہیزی غذا کھاتا ہوں' پیاز' لہسن' ادرک وغیرہ کے استعمال سے صحت مند رہتا ہوں اور رفتہ رفتہ یہ تکلیف پہلے سے بہت کم ہو رہی ہے کیونکہ میں نے اسے دل سے نہیں لگایا (کہ مجھے ہارٹ پرابلم ہو گئی ہو اب کیا ہوگا) میرا خیال ہے کہ پرہیز سے انسان بہت ساری بیماریوں پر قابو پا سکتا ہے۔ ہاں اگر آدمی کا Time ہی پورا ہو گیا ہے تو اس کا علاج تو ہے نہیں۔ لکھنے اور پڑھنے کا شوق اس پر سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور میں ہمیشہ قناعت پسند رہا ہوں۔ دوران ملازمت اور اس کے بعد بھی کیونکہ میں نے یہ راز پا لیا ہے کہ وقت سے پہلے اور مقدر سے زیادہ کسی کو کبھی کچھ حاصل نہیں ہے اور وہ پروردگار انسان سے بے پناہ محبت کرتا ہے اس کو پالینے کے بعد قناعت پسندی تو لازم ہے اور جو شخص قناعت پسند ہے پھر اس کی تکلیفیں کہاں رہ جاتی ہیں اور پھر جب میں اپنی دعاؤں میں ہر شخص کا بھلا چاہتا ہوں تو مجھے کیونکر تکلیف ہوگی۔ میرے بھائی گلزار love the creature and be happy ۔اسی سلسلے میں ایک مرتبہ میری بھانجی نے کہا کہ تم تو اتنی کتابیں چھپوا رہے ہو میرے نام پر بھی کوئی کتاب چھپوا دو...چنانچہ اُن سے میں نے کھانا پکانے کی Recip لیں اور مناسب طور سے ان کو ترتیب دے کر ایک کتاب Mother's touch انگریزی میں چھپوا دی (ان کے نام سے) اور ایک اور کتاب Bakers Dream جس میں کیک وغیرہ سے متعلق انفارمیشن ہے اس میں میرے چار مہینے تو صرف ہوئے مگر وہ بے حد خوش ہو گئیں' Femina وغیرہ میں کافی نام ہوا اور ایک لاکھ سے زائد روپے بھی منافع میں لئے۔ کیونکہ انگریزی میں لوگ خرید کر پڑھتے ہیں مگر اردو کتابیں کا اس سے الٹ ہے کوئی شخص خرید کر نہیں پڑھنا چاہتا۔

☆ اکثر احباب سرکاری ملازمت کے دوران جسمانی توانائی سے عاری ہو جاتے ہیں جب کہ آپ نے نہ صرف سرکاری ذمہ داریوں کے بعد بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور صنعت و حرفت میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ذرا تفصیل سے فرمایئے کہ یہ سب کچھ انشورنکا وردان ہے یا آپ کی پلاننگ کا نتیجہ ہے؟

☆☆ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ پروردگار کا مجھ پر بڑا کرم رہا ہے کہ مجھے اس نے ہر حال میں قناعت پسند بنایا ہے اور آج جو کچھ بھی میں ـنے بذریعہ تعلیم و تربیت اور تجربات سے حاصل کیا ہے سب اس پروردگار کا ہی کرم ہے میری planning کا اس میں ذرہ برابر بھی حصہ نہیں کیونکہ مجھے راہ ملتی گئی اور میں سفر اعادہ کرتا رہا۔ پڑھنے کے مواقع تو اس نے ہی فراہم کئے ۔بس بڑھتا ہی رہا۔

☆ اردو کے ساتھ آپ نے ہندی زبان میں بھی ادب تخلیق کیا ہے آپ کی محبوب زبان اور اس سے جذباتی لگاؤ کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ نہیں میرے بھائی گلزار۔ اردو میری محبوب زبان ہے میں نے ہمیشہ اسی میں لکھا یہ تو اپنے بچوں کے لئے اپنی کتب کو ہندی میں لکھنا چاہا کہ وہ بھی میری کتب سے محظوظ ہو سکیں ورنہ میں نے تو ۳۰ دن میں ہندی سیکھی ہے وہ بھی اس لئے کہ میری ایک دوست انگریزی اور اردو زبان نہیں جانتی تھی اور مجھے کبھی کبھی خط لکھنا ہوتا تھا۔ اس لئے یہ میری مجبوری تھی۔ اور پھر میری زبان آج کل سلیس اردو ہے اور فارسی کے الفاظ کا استعمال بہت کم کر رہا ہوں البتہ جو غزلیں اور نظمیں آپ کو ارسال کر رہا ہوں اُن میں کچھ سخت الفاظ ضرور ہوتے ہیں۔ ہندی میری مجبوری اور اردو میری محبوب زبان ہے۔

☆ چلئے صاحب بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اردو کو اپنی محبوب زبان گردانا مگر آپ کے وطن میں میر و غالب کی زبان سے جو ناروا سلوک ہو رہا ہے اس کے بعد آپ اس کے مستقبل کی بابت کیا خوش فہمی قائم کر سکتے ہیں؟

☆☆ اردو سے بھارت میں ناروا سلوک تو نہیں ہوتا بلکہ کچھ اردو والے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرتے رہتے ہیں۔ اور ایک ہی فرقے کی جانب اس کی رہ موڑتے رہتے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی کیونکہ آج بھی غیر مسلم شعرا اور ادیب سینکڑوں کی تعداد میں لکھ رہے ہیں۔ اور لاکھوں اس زبان سے ہی اپنا کام چلاتے ہیں ۔اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اس زبان کے ساتھ ناروا سلوک ہو رہا ہے کہ یہ ایک چلتی ہے اور کچھ نہیں۔

☆ سنا ہے! آپ نے انجمن بہبود اہل قلم طرز کی کوئی تنظیم قائم کی ہوئی ہے؟ اس کے اغراض و مقاصد اور کامیابیاں کیا ہیں؟

☆☆ گلزار بھائی۔ ایک زمانہ تھا جب بہت ساری انجمنیں قائم کی تھیں جس میں ڈاکٹر خلیق انجم اور دیگر احباب تھے۔ غالب ہاؤسنگ سوسائٹی۔ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جس کے لئے تین سو فلیٹ تعمیر کروائے گئے اور شاعروں اور ادیبوں کے لئے رہائشی انتظام کیا اور یہ کافی کتابت شماری سے بنوائے گئے ہیں مگر میں اب اُن سے اس لئے الگ ہو گیا ہوں کہ اب عمر اور صحت اجازت نہیں دیتے۔

☆ فتح بھائی! آپ حمد و بلکہ بہت حمد لکھتے ہیں مگر مشاعروں سے آپ کی دوری' ہماری طرح بہت سے احباب کے لئے سوالیہ نشان ہے؟

☆☆ گلزار بھائی 54-1953 میں نشستوں میں حصہ لیتا رہا ہوں اور کئی غزلیں طرحی بھی کہیں مگر اس میں مجھے لطف نہیں آیا کیونکہ میں رو میں نہیں بہہ سکتا تھا اور اپنے دل کی بات کہنے سے قاصر رہتا تھا۔ پھر جب میں اس طرح کے مشاعروں میں حصہ لینا ترک کر دیا تو جی بےحد خوش ہوا کہ میں اپنے جذبات میں غرق ہو کر شعر کہہ سکتا تھا۔ اب تو مدت ہوگئی ہے کوشش بھی اختیار کئے ہوئے ہوں۔ جس سے مجھے بےحد سکون میسر آتا ہے۔

☆ ایک طرف اردو زبان و ادب کا دامن تیزی سے سمٹ رہا ہے دوسری طرف نئے نئے طرح کے تجربات اور ایجادات کا سلسلہ بھی جاری ہے بےجا نوازشات اور گروہ بندیاں بھی عروج پر ہیں۔ آپ کے خیال میں مستقبل کے چیلنجوں سے مقابلے کے لئے اردو زبان و ادب کے لئے کونسا راستہ بہتر و مناسب ہے نیز مستقبل کی بابت آپ اپنی محبوب زبان و ادب کی نسبت کس طرح کا حسن ظن قائم کئے ہوئے ہیں اور کس طرح کا نسب العین تجویز کرتے ہیں۔

☆☆ میرے بھائی سیاست نے ہی اردو زبان کو نقصان پہنچایا ہے اور ایک ہی قوم کی زبان کی پہچان کر کے اس کو غیر مسلم لوگوں سے دور کرنے کی کوشش کی ہے اور کچھ لوگ تو خاموشی سے یہ تماشہ دیکھتے رہتے ہیں مگر اردو آج تک زندہ ہے اور صدیوں تک زندہ و جاوداں رہے گی۔ کوئی کچھ بھی کرے اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ اس قدر لوگوں میں محبوب ہے کہ فلموں میں بھی بڑے پیارے ڈھنگ سے در آئی ہے کہ ہندی پڑھنے والے لوگ بھی اسے شوق سے گاتے پھرتے ہیں۔ "خون بہا" میرے شعری مجموعے میں "نوحۂ اردو" کے ذیل میں میں نے ایک طویل نظم لکھی ہے۔

☆ آخر میں اگر ہم آپ سے آپ کی دیرینہ خواہش "گستاخی نہ ہو تو آخری خواہش کا لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں" کی بابت دریافت کریں تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟

☆☆ آخری خواہش یا پھر تمنا۔ بقول غالب "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"

مگر میری تو صرف ایک ہی تمنا ہے کہ خطہ بھارت اور پاکستان میں آپس میں میل بڑھے رنجشیں دور ہو جائیں اور ہم آپس میں بھائی چارہ، محبت اور اعتبار پھر سے قائم کریں اور یہ دوریاں مٹ جائیں اور یہ نفرت، بغض اور بےاعتباری کے بادل چھٹ جائیں۔ اور ہمارے دلوں میں ذہنوں میں محبت کے ترانے پروان چڑھیں اور یہ ہم شاعر اور ادیب اور الیکٹرانک میڈیا پر بہت حد تک منحصر ہے اور نفرت پھیلانے کی بجائے محبت پھیلائیں، اور ہر اس ادب سے گریز کریں جو نفرت کا درس دیتا ہے اس نظم کو شائع ہی نہ کریں جس سے نفرت کی بو آتی ہو سیاست داں تو اپنا الّو سیدھا کرنے کے لئے ہم لوگوں کو استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم ایسے لوگوں سے کس طرح کنارہ کش ہو سکتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی میں پیار ہی کو افضل مانا ہے اور جانا ہے اور جس کو چاہا اس کو ٹوٹ کر چاہا ہے اس میں قوم و مذہب کو کوئی بھی دخل نہیں رکھا۔ میرے ایک جگری دوست محسن علی خان کا بھی یہی کہنا ہے جس کو چاہو ٹوٹ کر چاہو بلا کسی مطلب کے۔ گلزار بھائی وہ شخص بھی غضب کی چیز تھا۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر خلیق انجم (اردو گھر) جن سے مجھے بےپناہ محبت ہے وہ بھی اس شخص کو جانتے تھے کہ ایسا شخص شاذ و نادر ہی پروردگار گلزار ہست و بود میں بھیجتا ہے اور پھر بقول ڈاکٹر محمد اقبال:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اسی پر اب چند اشعار آپ کی نذر ہیں:

جری سرشت میں لا انتہا محبت ہے
لٹائے جا یہ لٹانے سے اور بڑھتی ہے
انہیں کے دل سے برسے جتنے پریم کے بادل
فلک سے آتی ہی اتریں گی میٹھی برساتیں
جو دل میں پیار کی دولت ہے تو لٹائے جا

نہ کر بھروسہ کوئی عقل پہ ذہانت پہ
نماز و تقویٰ و قربانی و عبادت پہ
بھروسہ کرنا ہے تجھکو تو کر محبت پہ
نہ حصول جنت و پناہ جہاں محبت ہے
جو اعتبار کی ہے چیز تو محبت ہے

نظر سے پریم کی کثرت میں دیکھ وحدت کو
خدا کے بندوں میں تو دیکھ اس کی صورت کو
وہی ہے جلوہ نما ہر بشر کے قالب میں
وہ تیرے سامنے موجود ہے عبادت کو
جسے تو دیر و حرم میں تلاش کرتا ہے

نہ ہو جو پریم تو سنسار کی حقیقت کیا ہے!

دُعائے خیر

میں بندہ، تُو ہے خدا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
مجھے بھی اپنا بنا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

تیری رضا تھی، مجھے تُو نے زندگی بخشی
غمِ جہاں سے چھڑا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

دعا ہے، میرا ہر اک ریشۂ جسمِ خاکی کا
پکارتا ہو سدا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

کوئی ہے ہندو یہاں اور کوئی مسلم ہے
مگر ہیں تجھ سے جُدا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

جب ان کے جسموں میں روح پھونکی تو تب تو نہیں
نہ تھا کچھ اپنا پتا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

یہ تیرے نام پہ خنجر اٹھائے پھرتے ہیں
تُو راہِ راست دکھا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

عطا ہو ان کو بصارت بھی، اور بصیرت بھی
کہ سوچیں سب کا بھلا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

تیرے حضور میں آیا ہوں گرتا پڑتا ہوا
میں، ایک آبلہ پا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

گناہگار و خطاکار ہوں، خداوندا!
رہِ نجات دکھا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

تُو اپنے تشنہؔ کو توفیقِ بندگی دے دے
یہی ہے تجھ سے دُعا، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

سخن سیرابیاں

انتخاب بشکریہ شاعر

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

اے اَمر آتما!

نہ تن ہے، نہ مَن ہے، نہ کرتا ہے تُو
وہ کرتا ہوں مَیں ہی، جو کرتا ہے تُو

نہ اگنی جلاتی ہے تجھ کو کبھی
سکھاتی نہیں دُھوپ تجھ کو کبھی

پانی بھی تجھ کو گلا نہ سکے
نہ کٹتا ہے تُو تیغ کی دھار سے

امر آتما! پھر تو کِس سے ڈرے
ہیں پھر کِس لئے یہ ترے وسوسے

نہ لایا ہے تُو کچھ کہیں سے یہاں
تجھے جو ملا، وہ ملا ہے یہاں

یہ مایا تو پھرتی ہوئی دُھوپ ہے
کبھی ہے یہاں، اور کبھی ہے وہاں

یہ آئے تو اس کی خوشی بے سبب
یہ جائے تو اس کی غمی بے سبب

نہ ماضی ترا، اور نہ کل ہی ترا
ترا ہے وہی جو کہ ہے چل رہا

تُو کرموں کے بندھن میں ہے برملا
جُڑا ہے ترا حال سے سلسلہ

کھلونا ہے ہونی کے ہاتھوں کا تُو
وہ کرتا ہوں میں ہی، جو کرتا ہے تُو

بھلا ہے اسی میں کہ سب بھول کر
جُھکا میرے قدموں میں تُو اپنا سر

سو میرے اے تشنہؔ، سب کچھ بھلا
کہ میں ہوں تری مکتی کا راستہ

ہاتھ میں انساں کے ہے خود ہی قلم
اپنی قسمت آپ کرتا ہے رقم

آدمی ہے اپنی قسمت کی بہار
فکرِ بہتر سے ہیں پیدا نیک کار

نیک سیرت کا بنے جس سے حصار
نیک فطرت دے مقدر زرنگار

جو بدل سکتا ہے قسمت آدمی
وہ حقیقت میں ہے قسمت کا دھنی

یہ حقیقت ہے نہیں منظر کشی
جھوٹ کی ہمدم نہیں ہے بھیروی

وہ تو ہیں کم فہم جو باور کریں
قوتِ اعمال سے جی لیں، مریں

جدّ و جہد آخر میں کیوں کرتا رہوں
یہ مری تقدیر ہے جیسے جیوں

قائلِ تقدیر پر آئے جمود
حرکت و افعال ہیں حرفِ نمود

یہ شریعت پر عمل بالکل نہیں
یہ غلط فہمی ہے میرے ہم نشیں

یہ غلط احساس ہے، اک بھول ہے
آئینے پر عقل کی یہ دھول ہے

ہے کسی ذی ہوش کی ایسی مثال
جس نے پوچھے ہوں کبھی ایسے سوال

اپنے ادراک و عمل سے ہے یہ حال
خود بُنا تم نے مقدر کا یہ جال

اپنی خواہش کے مطابق خود چنو
صحبتِ درویش میں اے ہم نشیں

وہ بدل جائے گا اِک دن بالیقیں
ہو گا پھر قول و عمل سے دل نشیں

منظوم خط

(اپنے پتا جی کے خط کے جواب میں)

محترم پوجیہ پتا جی آپ کو پرنام ہے
نثر ہو یا شاعری مجھ کو ادب سے کام ہے
آپ کا خط ایک ہفتہ پیشتر مجھ کو ملا
میری خاموشی سے ناحق دل ہے مضطر آپ کا
آپ کے اس خط میں تھے شکوے شکایت بیشمار
رکھ رہے ہیں جو مرے زخموں پہ مرہم بار بار
آپ لکھتے ہیں کہ میں دیتا نہیں خط کا جواب
مَیں بھی خود حیران ہوں ایسا ہوا کیونکر جناب
مَیں ہوں اک ہارا مسافر اس سفر سے تھک چکا
جینے کو جیتا ہوں لیکن زندگی سے ہوں جھک چکا
میں نے دنیا میں جسے چاہا وہی مجھ سے چھٹا
میرے دل کا قافلہ ان شاہراہوں پر لٹا
لکھ رہا ہوں یہ جواب اشکوں کا دامن تھام کر
تھک کے بیٹھا ہے یوگندر زندگی کی شام کر
آج تک تعمیر میں جس کی لگائی تھی حیات
بجلیوں کی زد میں آ کر جل گئی وہ کائنات
آپ نے پرواز کے بارے میں پوچھا ہے سوال
میری قسمت کو نہ آیا میرے ارماں کا خیال
اس کو لو دینے کی خاطر شمع ہستی بیچ دی
پر یہ کوشش اس بڑی شکتی کے آگے ہیچ تھی
کس لیے پرواز میں شامل ہوا یہ ہے ملال
مجھ سے مت پوچھیں مری بگڑی ہوئی قسمت کا حال
فکر مجھ کو کھائے جاتی ہے نہیں ملتا سکوں
اضطراب غم سے دل ہے ٹکڑے ٹکڑے کیا کہوں
زندگی کی دوڑ میں ہونے نہ پایا کامیاب
ایک جاں ہے اور دنیا بھر کے رنج و اضطراب
آپ کہتے ہیں نہیں پرواز میری رائیگاں
زندگی خوش حالیاں اک روز کر دے گی جواں
امتحاں میں فوج کے میں ہو گیا ہوں کامیاب
پڑ گیا ہے اس لیے کچھ سرد میرا اضطراب
ایک مدت سے نہیں آیا ادھر بھائی کا خط
ان سے کہیے اب نہیں کر سکتا میں آنسو اپنے ضبط
خط مدن کا ایک عرصے بعد آیا ہے مجھے
اس نے ننھے کے جنم دن پر بلایا ہے مجھے
خیر کچھ بھی ہو مگر لکھنے کی کچھ زحمت تو کی
دور رہ کر اس نے میرے پیار کی حرمت تو کی
خط میں لکھا تھا اسے آنے نہ پاؤں گا وہاں
کیونکہ دیوار معیشت آ گئی ہے درمیاں
اب اجازت چاہتا ہوں رات کافی ہو گئی
ہے عروس خامشی بیدار دنیا سو گئی
ماں بہن بھائی وہاں سب کو مرا پرنام ہے
خوش رہیں بچے بہن کے یہ دعا پیغام ہے
آج تو اتوار ہے ڈالوں گا اس نامے کو کل
آپ کا لخت جگر دل بند یوگندر بہل

(کانپور، ۲۹ جون ۱۹۵۱)

عشق کی آزادیاں، بیداریاں
بڑھ رہی ہیں حسن کی دلداریاں

دیکھتے ہو تم جو سینہ داغ داغ
ہیں یہ چشمِ شوخ کی گُل کاریاں

کیا کریں معجز نما عیسیٰ نفس
لا دوا ہیں دل کی یہ بیماریاں

رات بھر آرام سے، وہ محوِ خواب
میری آنکھوں میں فقط بیداریاں

عشق میں جب جاگ جاتی ہے انا
حُسن پھر کرتا ہے خود دل داریاں

اندر اندر آگ بڑھتی ہی گئی
عشق نے دہکائیں وہ چنگاریاں

تشنہ جس کو میکدہ کہتے ہیں لوگ
ہم نے دیکھی ہیں وہاں دلداریاں

آتی ہے فغاں لب پہ مرے قلب و جگر سے
کھل جائے نہ یہ بھید کہیں تیری نظر سے

رکھا ہے ترے غم کو ہمیشہ تر و تازہ
ٹپکا لہو آنکھوں سے کبھی زخمِ جگر سے

لے چھوڑ دیا شہر ترا، کہنے پہ تیرے
اب ہو گئے ہم دور بہت تیرے نگر سے

دنیا پہ ہوا راز محبت کا یوں افشا
تڑپایا بہت تو نے اُٹھایا ہمیں در سے

منسوب ہیں تجھ سے جو محبت کے فسانے
وقت آیا تو لکھیں گے کبھی خونِ جگر سے

سینے میں کہیں رُکتا ہے سیلابِ جنوں خیز
دل خون ہوا میرا محبت کے اثر سے

سیلابِ حوادث بھی ہوا شرم سے پانی
آنکھوں سے مری اشک کچھ اس شان سے برسے

نالۂ اُردو

یہ کس دہانے پہ لے کے پہنچے ہو مجھ کو آخر؟
ترقیوں کی قبا تو پہنی ہوئی ہے میں نے
ہے میرے آگے عمیق خندق
جو میری بربادیوں کا ساماں لئے ہوئے ہے
لکھی ہے شاید مرے مقدر میں اب عجائب گھروں کی زینت!!!

مگر تمہاری یہ خامشی بھی عجیب شے ہے
تمہاری یہ مصلحت ہے شاید!
کہ تم مرے نام کے وظیفوں کو ہضم کرنے کی فکر میں ہو
تمہیں یہ پروا نہیں ہے ہرگز
کہ میں جو تھی ایکتا کی ضامن
سمٹ سمٹ کر
بس ایک فرقے تلک ہی محدود ہو رہی ہوں

اگر یہی میرے روز و شب ہیں
تو میری زلفیں سنوارنے کو کہاں سے آئے گا کوئی داغ
کہاں اُٹھائیں گے ناز میرے خیال و فراق
نہ کرشن موہن نہ کوئی راہی نہ کوئی کھتر نہ راز و تجاہل
نہ کوئی آزاد اور نہ سرور میری خاطر
اپنے دل کا خوں جلا کر
جہاں کو درسِ خلوص دے گا
نہ پھر مرے گلشنِ خیالی کے پھول ہوں گے
وشت، وحیرت، ظفر، پیامی، حفیظ، تراب
کہاں سے لاؤں گی ڈھونڈ کر میں
جناب عاقل، اطہر، کول، ماہرِ غالبیات مالک
ادب کے ٹیگور اور دیوندر اسر
کنول بھی کوئی نہیں کھلے گا
افق پہ میرے قمر بھی کوئی نہیں رہے گا

بھلا چکے ہوں گے مجھ کو
گلزار، سوز، دور، ساغر، پرکاش، دراہی، گمار، پاشی
نہ کوئی خنداں، نہ ناشک، نہ پچھا، نہ کوئی کول، نہ پھر گلاٹی
مرے خیالوں میں گم رہے گا
نہ ہوگا رقصاں طاؤس، نہ کوئی، نہ کوئی کرتا رہے گا
ریڈیو پر نشر کرے گا نہ شک، نہ کوئی
نہ کوئی بادی، نہ کوئی راہی، نہ کوئی رہبر

مرے لئے شبوں میں جگے گا
وہ شخص جو تھا ازل سے تشنہ، کہاں مرے دل کا حال لے گا
نہ آئے گا رام لال، کوئی مری حفاظت کو تیغ لے کر
نہ ہوگی ملا کی سرپرستی بھی مجھ کو حاصل
نہ گورو کوئی دکھائیں گے قلم کے جوہر
نہ آئے گا پھر کوئی جگندر مرے فسانے سنوارنے کو
نہ جگمگائے گا کوئی مہتاب میری شب کو
نہ پھر مرے آسماں کی زینت بنے گا تارا
مشاعروں میں دکھائی دے گا سحر نہ کوئی
نہ نور، ناصر سنائی دیں گے
کہانیوں کے رتن بھی ڈھونڈے نہیں ملیں گے
دکن سے اُٹھے گا پھر نہ کوئی شری نواس اور اُس کے ساتھی
جو اپنی شعلہ نوائیوں سے مجھے بقائے دوام دیں گے
میرے گلشن کے ان گنت اور بھی کئی پھول تہہِ خاک ہوں گے
دو دہائی میں کھیل سارا یہ ختم ہوگا
نہ ہوگی مجر ال کی محبت بھی مجھ کو حاصل
کہ میرے قاتل
اُسے بھی راستہ نہ دیں گے
نہ پھر کوئی تم سے کہہ سکے گا
کہ تم ہو میری بقا کے دشمن
ہو میرے قاتل
کہ تم مرے نام کے وظیفوں پہ پل رہے ہو!

[illegible]

وہ میرا ضامن

خاں حسن علی خاں کی رحلت پر

وہ میرا ضامن، وہ میرا ضامن جو پیار کرتا تھا زندگی سے
وہ میرا ضامن، وہ میرا ضامن کہ جس کو نفرت تھی تیرگی سے
وہ میرا ضامن، وہ میرا ضامن جو پیار کرتا تھا آدمی سے
نہیں رہا ہے، نہیں رہا ہے، نہیں رہا ہے

کہا تھا اُس نے یہ مجھ سے اکثر کہ میرے مرنے کے بعد مجھ کو
اُسی زمیں کے سپرد کرنا، جہاں ہے آرام گاہ ساغر
اُڑائی تھی اُس کی بات میں نے، ہمیشہ یہ بات اُس سے کہہ کر
کہ موت چنتی نہیں زمیں سے تمہارے ایسے وفا کے پیکر

مگر عجب نظمِ زندگی ہے کہ بات میری بھی اُڑ گئی ہے
نہیں رہا ہے، نہیں رہا ہے، نہیں رہا ہے وہ میرا ضامن

وہ میرا ہمدرد، میرا غمخوار، میرا مونس، وہ میرا ساتھی
لحد کی آغوش سے برابر مجھے یہ پیغام دے رہا ہے
کہ بہل صاحب ہنسی اُڑانے سے موت ٹلتی نہیں ہے ہرگز
کہ موت برحق ہے، اک حقیقت ہے، اک حقیقت ہے، بہل صاحب

سلام کرتا ہوں، اُس حقیقت نوا کو.... عبرت کی وادیوں سے

مدن موہن بہل (مرحوم)

مرحوم مجھ سے تین سال بڑے تھے اور تلاشِ معاش کی خاطر کلکتہ چلے گئے تھے اور برسوں وہاں کے کیمپ کے باوجود تیس سال گلے میں رہے۔ گروہ وہاں کے ہر شخص کا پیار حاصل کیا ہر کسی سے بےلوث محبت کرتے رہے۔ قدرت کو ان کی حالت پر ترس نہ آیا اور ایک دن چلتے چلتے موسموز گر گئے اور پھر چند دن ہسپتال میں رہ کر ہم سب کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۳ء

سانحہ کیسا تری تقدیر نے لکھا ہے آہ
اے مدن موہن ترے مرنے سے یہ دل ہے تباہ

خطۂ دِلّی تری فرقت میں تھا کب سے اُداس
دوستوں کی آنکھ بھی محروم ہے اب تجھ سے آہ

تو کہ تھا حق کا پجاری حق نہ راس آیا تجھے
اس سیہ دنیا میں جیتے ہیں فقط کچھ روسیاہ

تو گیا پردیس تو پھر دیس کو لوٹا نہیں
دیکھتی تھی دیس کی دھرتی ترے آنے کی راہ

دیس اک اپنا بسایا تو نے پھر پردیس میں
باغ سے روٹھی ہوئی بلبل نے لی جنگل کی راہ

عالمِ غربت میں سب کو چھوڑ کر تو چل دیا
دشتِ غربت میں رہا، تو نے اجل سے کی نباہ

حق میں سب احباب کے تشکام تھے سب تیرے کار
موت کے بستر پہ کیوں رہتی تجھے خدمت کی چاہ

تجھ سے آدابِ وفا سیکھے زمانے کا مزاج
پیار تھا بیٹے سے اپنے چل پڑا بیٹے کی راہ

اے مدن موہن، ترے مرنے پہ آہ
اے مدن موہن، ترے مرنے پہ آہ

(مدن موہن کا جوان سال بیٹا چندر سرتیل اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا تھا)

مری ہمدم، مری دمساز

(رفیقۂ حیات کو روگی کیفیت میں دیکھ کر)

زندگی درد کے صحرا میں ہے آوارہ قدم
غرق ہے دل مرا اشکوں کے سمندر میں صنم
سرد انفاس ہے سینے میں گھٹا جاتا ہے دم
ذہن مفلوج ہے بیماری سے تیری ہمدم

سوچتا ہوں کہ ترا درد بٹاؤں کیسے
تیرے آشوب کو میں دل میں بساؤں کیسے

میں! جو کہتا تھا مری جاں تری خاطر اکثر
کھیل سکتا ہوں کسی وقت بھی اپنی جاں پر
توڑ لاؤں گا ستارے بھی گگن سے بجا کر
اور پھولوں سے سجا دوں گا تری راہ گذر

آج شرمندہ ہوں وعدوں کو نبھاؤں کیسے
شدتِ درد سے میں تجھ کو چھڑاؤں کیسے

منکشف آج ہوا ہے کہیں حق و باطل
تیرے کس کام کا ہے میرا دھڑکتا ہوا دل
جان پر کھیلنا بھی ایسا نہیں ہے مشکل
چند بے معنی سے فقروں سے مگر کیا حاصل

تجھ پہ جو بیت رہی ہے وہ بھلاؤں کیسے
رشتۂ درد مسیحا سے چھپاؤں کیسے

تیرے اس حال نے کچھ ایسا کیا مجھ پہ کرم
کھل گیا مجھ پہ مری جان رفاقت کا بھرم
آج سب ٹوٹ گئے تجھ سے مرے قول و قسم
ترجماں ہے مرے غم کی مری چشمِ پرنم

میں کوئی وعدہ نبھاؤں تو نبھاؤں کیسے
چیر کر اپنا کلیجہ بھی دکھاؤں کیسے

مضطرب کتنی ہے اے جان طبیعت تیری
تیری آنکھوں سے جھلکتی ہے نقاہت تیری
دیکھی جاتی نہیں یہ درد کی شدت تیری
مجھ کو مل جائے مری جان علالت تیری

روح بن کر تیرے قالب میں سماؤں کیسے
پھر سے شادابی ترے چہرے پہ لاؤں کیسے

کاش، اے کاش! ترا درد مجھے مل جائے
مجھ پہ جو بیت رہی ہے، وہی مجھ پر بیتے
یاالٰہی! فقط اتنا سا کرم تو کر دے
میری دم ساز، مرے ساتھ جیے، ساتھ مرے

فی نکس 'Phoenix'

کس قدر دلگداز ہے مژدہ
یاسیت نے اٹھا لیا پیرا

بج اٹھی پھر سے شہنائی
آرزو مندتوں کی بر آئی

زیست لینے لگی پھر انگڑائی
زندگی میں بہار لوٹ آئی

نکلا فی نکس سے چاند پونم کا
دیر آئید درست ہے نکلا

پھر سے الفت ہے پاسباں اس کی
دل پہ خوشیوں کی حکمرانی بھی

تلخیوں کو شکست دیکر ہی
مثلِ فی نکس وہ راکھ سے اُبھری

اور پایا ہے پیار شوہر کا
وہ بھی تو ہے پیار کا پتلا

سرخرو ہو گئے ہیں آج پدر
لیں گے اپنی وہ عافیت کی خبر

تو بھی رندوں کی لے خبر ساقی
تشنہ کوئی رہے نا اب ساقی

یوں ہوں سیراب آج سب کے سب
میکدے سے اٹھیں نہ تشنہ لب

پونم زرخ Phoenix

ایک بےحد خوبصورت خیالی پرندہ جو پانچ سو سال زندہ رہنے کے بعد خود کو جلا کر راکھ کر لیتا ہے اور اسی خاک سے از سرِ نو پھر جنم لیتا ہے۔ پونم نے بھی اس خیالی پرندے کی مانند اپنی حرماں کی مختصر زندگی کی گردشوں تنہائیوں تلخیوں اور تاریکیوں کو ترک کر کے علاحدگی اختیار کر کے امریکہ کے اسی پرندے کے نام سے آباد شہر فی نکس سے اپنی ازدواجی زندگی کے لئے شریکِ حیات پسند کیا اور از سرِ نو اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا (آج [illegible])

شکریہ میرے رب

پروردگارِ عالم شکریہ
تُو نے مجھے جب جو مانگا دیا

عمرِ پیری انشورنس نہ ہوئی
"یا اللہ خیر" کہا چل دیا

پردیس میں تیرا تھا آسرا
تُو نے بھرم یقیں کا مرے رکھا

صحت و آرام تھا ہر گھڑی
زیست کی نعمتیں پائیں سدا

کہنے کو تھی تشنگی پہ نہ تھی
تُو نے تشنہ کو سیراب رکھا

کیلیفورنیا (2004) میں انشورنس نہ ہونے پر۔

جادۂ شوق کا دردمند شاعر

ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی

ارسطو سے لے کر دورِ حاضر تک شاعری کی تعریف کے سلسلے میں مختلف ناقدین نے مختلف انداز میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے لیکن کسی کی تعریف کو قطعیت کے ساتھ حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے یہ ایک گہرا تر باغِ تخیل ہے حسن، صداقت اور شاعری اس کی کوئی منطقی اور حتمی تعریف ممکن نہیں۔ ایک دفعہ بیدی سے کسی نے سوال کیا کہ شعر و شاعری کیا ہے تو اس پر کہنے والے نے بڑی خیال انگیز بات کہی تھی۔

"میں جانتا ہوں اگر مجھ سے نہ پوچھا جائے اور اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں نہیں جانتا"

ارسطو نے شاعری کو زندگی کی نقالی قرار دیا۔ جعفر اور سوز وغیرہ کے قلب میں ڈھلتی ہے۔ کولارج کے نزدیک "شاعری مترنم تخیل کا نام ہے" شبلی کے خیال میں "شاعری عام طور پر تخیل کے اظہار کا نام ہے" میر نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

کہا تھا شعر تو پردہ سخن کا — وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

شبلی نے شاعری کی منطقی تعریف یہ کی ہے "جو جذبات الفاظ کے ذریعے ادا ہوں وہ شعر ہیں۔" ابن رشیق کے خیال میں "شعر وہ کلام ہے جو موزوں و مقفیٰ با ارادہ لکھا گیا ہو" ولیم ہیزلٹ نے کہا تھا "شاعری تخیل اور جذبات کی زبان ہے۔ شاعری ایک وجدانی اور الہامی تخلیقی عمل ہے یہ جذبات اور تخیلات سے جنم لیتی ہے اور ان جذبات کا اظہار اشعار کی شکل میں ہوتا ہے"

مذکورہ بالا تعریفوں کی روشنی میں اگر تشنہ کی شاعری کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ خون بہا اور احساس کی صلیب کا شاعر اعلیٰ پائے کا تخلیق کار ہے۔

تشنہ 27 نومبر 1928 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی زندگی نوشہرہ (موجودہ پاکستان) میں گزری۔ تعلیم مکمل کر لینے کے بعد گہوارۂ علم و دانش دہلی تشریف لے آئے۔ تشنہ کے والد شری ست سنگھ ایک دانشور اور متبحر بزرگ تھے۔ ان کی والدہ ایک سلیقہ شعار اور صالح خاتون تھیں۔ ڈاکٹر تشنہ نے 1944 میں ایس ڈی سناتن دھرم ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جس کے بعد وقت روزنہ "رائے عامہ" کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے چند روز تک آفس کلرک کی حیثیت سے انجینئرنگ ٹریننگ سنٹر نوشہرہ میں بھی کام کیا۔ 25 مارچ 1947 کو انڈین ایئر فورس میں ملازمت اختیار کر لی۔ ایئر فورس کی ملازمت کے سلسلے میں انہیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ 1962ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے Pest Control کے میدان میں بیرونی ممالک سے نہ صرف کئی ڈگریاں حاصل کیں بلکہ اس میدان سے متعلق انگریزی زبان میں چند کتابیں بھی لکھیں۔ علاوہ دیگر کتابوں کے تشنہ کی اردو تصنیفات میں بھیم سین ٹھکر ادیب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اردو کے ایک ایسے مخلص اور مسکین شاعر کے فن و شخصیت کا احاطہ کیا ہے جس نے اپنی پوری زندگی اردو کی خدمت میں صرف کر دی۔ علاوہ ازیں مصنف کے دوسرے مجموعے "احساس کی صلیب" اور "خون بہا" منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن کو اردو کے ناقدین اور صاحب الرائے حضرات نے کافی سراہا ہے۔

تشنہ شاعر ہونے کے ساتھ افسانہ نگار بھی ہیں ان کے افسانوں کا پہلا انتخاب "تشنگی کے نام" سے منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ پیکرِ خلوص ہمدرد انسان دوست قومی یکجہتی کے علم بردار مشرقی روایات کے امین امن و آشتی کے پرستار پاک طینت علم دوست اور ادب نواز ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ کی انسان دوستی کے بارے میں اردو کے معروف محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی فرماتے ہیں۔ "وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں۔ دلکش مسکراہٹ کے دوران گفتگو کرتے ہوئے پیچیدہ مسائل پر بڑی معقولیت کے ساتھ رائے دیتے اور ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ ان کی معاملہ فہمی اور بصارت ایک کارفرما عنصر کی حیثیت سے شاملِ گفتگو رہتی ہے ان کی انسانی خصوصیات ان کا فکر و تدبر انسانی ہمدردی اور خلوص و خدمت کا اعتراف میں خود بھی ایک زمانے سے ہوں۔ انہیں اپنے فن میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا جانے کی شدید خواہش ہے جسے غالب نے یوں کہا ہے اور آرزوئے ناتمام سے تعبیر کیا ہے یہ خیالات جنہیں فلسفہ کا نچوڑ کہیے تشنہ کے ذہن پر ہر پل چھائے رہتے ہیں۔

پروفیسر کامل قریشی کے بقول "تشنہ انسان اور انسانیت کے دلدادہ خلوص و محبت کے پیکر وطن پرست قومی اتحاد اور ملک کی سالمیت کے پرستار ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور روشن مستقبل کے نقیب بلا امتیاز مذہب و ملت رنگ و نسل تمام اقوامِ عالم کی فلاح و بہبود اور امن و آشتی کے علم بردار ہیں۔ تشنہ کے ان مذکورہ اوصافِ حمیدہ کا ہمیں اس وقت صحیح اندازہ ہوتا ہے جب ہم ان کی شاعری کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔" عشرت قادری جناب تشنہ کے بارے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں۔ "ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ اپنے پہلو میں ایک دردمند اور حساس ترین دل رکھتے ہیں۔ انسانی مساوات مذہبی رواداری اور نیک طینتی ان کی فطرت و مزاج کے اہم عنصر اور ان کی شاعری کی حقیقی بنیاد ہیں۔" ڈاکٹر اسلم پرویز نے "احساس کی صلیب" کے دیباچے میں تشنہ کی شخصیت کے آئینے میں مطالعہ کیا ہے۔

"ان کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ تشنہ نے کامیاب اور بھرپور حیات میں ان گنت تلخیوں کا زہر پیا ہے کہ وہ اس سے سیراب نظر آتے ہیں۔ تشنہ کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ جن میں ان کے نظریات ان کے عقائد ان کی مصلحتیں ان کی رفاقت ان کی نجی زندگی ان کے کاروباری مسائل ان کی چنتا اور چتا غرض تمام چیزیں شامل ہیں۔ ان میں بہت سی چیزیں براہِ راست شاعری کا موضوع ہوتے ہوئے بھی ہمیں ان کی شاعری میں اس لیے بھی نظر آتی

ہیں کہ وہ ان کے بارے میں سوچتے ہی نہیں بلکہ ایک تخلیقی فنکار کی حیثیت سے
انہیں محسوس بھی کرتے ہیں۔"

محقق کی مذکورہ بالا آراء سے تشنہ کی شعری صلاحیتوں اور ان کی جہتوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ تشنہ غزل اور نظم دونوں اصناف میں بیک وقت گہری دلچسپی اور شوق کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں اور مسلسل فنی شعر میں اپنی انفرادیت کو منواتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے برسوں اپنے فن کو پردہ خفا میں رکھا۔ لیکن جب ان کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا تو اہل ادب انگشت بدنداں تھے اور تشنہ کی شعری قدروں اور صلاحیتوں کا اعتراف کرنے پر فوری مجبور ہو گئے۔ ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ اردو کے ایسے بلند قامت شاعر ہیں جو نہایت خاموشی اور بے نیازی سے گزشتہ چالیس سال سے فن شعری آبیاری کر رہے ہیں۔

پیار سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں
پیار کی دولت سبھوں کو بانٹ دو
کیا دیا تم کو کسی نے بھول جاؤ
گزرے وقتوں کا کوئی بدلہ نہ لو

ان کی شاعری کے موضوعات مختلف النوع ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے وطن دوستی، امن آشتی اور باہمی خلوص و یگانگت کا پیغام دیتے ہیں۔

یہ فرق و امتیاز یہ نفرت کے سلسلے
آؤ مٹا دیں دوستو سب دل کے فاصلے
انسانیت کا نور محبت کی روشنی
یاروں سے کم نہ ہو ایک پل کے واسطے

ان کی شاعری کا ہر پہلو اپنے اندر بے پایاں دلکشی اور تاثر رکھتے ہوئے سخنوروں کی نازک خیالی پر صاد کرتی ہے۔ بقول نظیری

نپائے تا بہ عرش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

تشنہ کی شاعری قاری کے ذہن و دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ ان کے یہاں محاکات کی کارفرمائی، فطرت کی خیال انگیز عکاسی، الفاظ کا برجستہ اور برمحل استعمال کرب میں ڈوبے ہوئے خیالات کا اظہار قاری کے ذہن و دل کو دیر تک گرفت میں رکھتے ہیں۔

جب کوئی آسرا نہیں ملتا
اس کا در بھی کھلا نہیں ملتا

جس کے دل میں بھی جھانک کر دیکھو
کچھ غموں کے سوا نہیں ملتا

تنہائی ہے منزل منزل
ساتھی ہیں سب ایک دو پل کے

دل سے دل کی بات کرو کچھ
ہم آئے ہیں دور سے چل کے

تشنہ اردو کے ایک سیکولر شاعر ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک کے سیاسی عمائدین، علمی، ادبی شخصیتوں پر پابند اور آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ تشنہ کے یہاں تاریخ کا مطالعہ اور عصر حاضر کا زندہ و تابندہ شعری شعور اور تجربہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

تیری آنکھوں سے ملی جنبش مری تحریر کو
کر دیا میں نے مکمل خواب کی تعبیر کو

وہ زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو سادگی کے درمیان باتوں باتوں میں کہہ جانے والے حساس اور صاحب بصیرت شاعر ہیں۔

کچھ اس طرح کے ہم نے مسائل بنا لیے
اپنے ہی دوست ہم مقابل بنا لیے

ہر کام اپنے آپ سے منسوب کر لیے
پیچیدہ زندگی کے مشاغل بنا لیے

مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی، افکار میں پختگی، ایجاز و اختصار ان کے قادر الکلام شاعر ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے بے شمار سانحوں سے گزر کر انہوں نے تخیل شاعری کو پروان چڑھایا ہے۔ ان کی شاعری کا پس منظر وجدانی کیفیات ہیں۔ وہ زمانے کے ہنگامہ خیز واقعات سے متاثر نہیں ہوتے اس کے برعکس ان کے یہاں ذاتی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا منظوم اظہار زیادہ نمایاں ہے۔

ایک دیوار گرے گھر کی تو دل دکھتا ہے
میرے خوابوں کے تو سب تاج محل ٹوٹ گئے

منزلوں کے خواب تو سب ہو چکے ہیں پاش پاش
دوش پر اپنے اٹھائے پھر رہا ہوں اپنی لاش

تجھے محبت شناس کر کے قرار چھینا ہے تیرا
یہ جرم ہے میرا در حقیقت بتائی کیوں تجھ کو راہ الفت

چرائی آنکھوں نے نیند تیری غم محبت بھی میں نے بخشا
قصور میرا ہے میرے ہمدم اٹھا رہا ہے جو تو یہ کلفت

تشنہ کی آواز زندہ و توانا ہے۔ ان کے سوچنے اور بیان کرنے کا انداز اچھوتا اور نرالا ہے۔ زندگی اور سماج سے ان کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ان کی شاعری ایک صدا بہار چمن ہے۔ جہاں کائنات کی رنگا رنگی اور فطرت کی بے محابا منظر کشی موجود ہے۔ جب ہم موجودہ سماج کے منظر نامے میں تشنہ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ تمام مسائل جو زندگی میں حقیقت کی اساس ہوتی ہیں۔ قریبی قیاس

نظر آتے ہیں۔ تحسین کا جمالیاتی شعور ان کی شاعری میں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ محبت کا ادب اور شاعری میں کچھ اس طرح ذکر کیا ہے

یاد آ جاتے ہو تم
تیری خلوت سے جب مخمور ہو جاتا ہوں میں
انتہائے غم سے جب رنجور ہو جاتا ہوں میں
درد فرقت سے کبھی جب چور ہو جاتا ہوں میں
یاد آ جاتے ہو تم

غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نیند آتی بھی ہے کچھ کچھ تو تصور آمیز
یہ تصور دل شاعر کو ہوا دیتا ہے

میں پہنچتا ہوں تیرے ساتھ ستاروں سے پرے
دل میرا اک نئی منزل کی صدا دیتا ہے

قصۂ غم کی انتہا کر دوں
ہر طرف حشر بپا کر دوں

میرے دل میں جو قلزم غم ہے
اس سے تجھ کو بھی آشنا کر دوں

ولی سے لے کر فراق تک خمریاتی شاعری اردو میں کم و بیش ہر شاعر کے ہاں مل جاتی ہے۔ تحسین نے بھی خمریات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ سرور عشق میں سرور بادہ کا لطف اٹھاتے ہیں۔

اگر شراب نہیں ہے نہ ہو خمار تو ہے
سرور عشق سے بےخود بنا رہا ہے کوئی

ہمارے بہت سے فاضل دوست تحسین کو انگریزی کا آدمی قرار دے کر ان کی اردو دانی یا اردو نویسی کو کسی قدر پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ تحسین انگریزی زبان و ادب کا گہرا شعور ضرور رکھتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ ہیں اردو کے آدمی۔ اردو ادب ان کے مزاج بلکہ گھٹی میں شامل ہے ان کی تعلیم و تربیت پر اردو کا گہرا اثر رہا اور انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی اردو زبان میں فسانے کی تخلیق سے کیا۔ اسی باعث زبان پر انہیں استادانہ قدرت حاصل ہے۔

تحسین کی شعری قدروں اور فنی خصوصیات کا دل سے اعتراف از بس ضروری ہے وہ ایک اعلیٰ پائے کے تخلیق کار ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ علوم و فنون کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور وسیع خیالات رکھنے کے ساتھ اعلیٰ کردار کے حامل بھی ہیں۔ تحسین کا تخلیقی سفر جاری ہے جس میں ان کا جمالیاتی شعور پوری آب و تاب کے ساتھ جوبن دکھلا رہا ہے اور مستقبل میں بھی ہم تحسین سے بہت بہتر توقعات باندھنے میں حق بجانب ہیں۔

تشنگیوں کا شاعر

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

کہتے ہیں کہ قریب سے مکمل تصویر نہیں دیکھی جا سکتی، یعنی قربت ہمیں جزئیات تک رسائی اور ان کی تحسین و تجزیہ میں تو مدد دے سکتی ہے لیکن کسی مرقعے کے مجموعی تاثر سے قریب سے دیکھنے والا محروم رہتا ہے۔ یونس تشنہ کے اکثر دوست بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہیں۔ پیچیدہ مسائل پر بڑی معقولیت کے ساتھ رائے دیتے ہیں اور ان کا حل تلاش کرنے میں ان کی معاملہ فہمی ایک کارآمد عنصر کی حیثیت سے شریک رہتی ہے۔ ان کی یہ انسانی خصوصیات، اُن کا فکر و تدبر، انسانی ہمدردی اور خلوص پر خدمت کا معترف میں خود بھی ایک زمانے سے ہوں۔ دوستوں سے بھی اس کا ذکر سنتا ہوں لیکن یہ بات برسوں کے تعلق و تعارف کے باوجود مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکی کہ وہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ اُن کی غزلیں اور نظمیں ادبی حلقوں اور گاہ گاہ ادبی رسائل میں اشاعت پذیر ہوتی رہی ہوں گی لیکن انہوں نے نہ اپنی کسی شعری تخلیق کا ذکر کیا، نہ کوئی شعر سنایا۔ اپنی فکر کے فنکارانہ نمونوں کی یہ پردہ داری اور خلوتِ دل و دماغ میں پرورشِ فن کا یہ جذبہ یونس کی ادبی شخصیت کا عجیب و غریب پہلو ہے۔ ورنہ ہمارے زمانے میں تو بہت سے اہلِ سخن ایسے ہیں جو فکرِ سخن سے شہرتِ شعر میں یقین رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے شعری مجموعے "احساس کی صلیب" کو دیکھا تو بہت دیر تک اُن کی شخصیت کے اس پہلو سے اپنی ناواقفیت پر حیرت کرتا رہا اور جب اس کے مشمولات سے گزرا تو بار بار اس بات کا خیال آتا رہا کہ انہوں نے اتنے دنوں تک اُسے چھپائے کیوں رکھا، چھپوایا کیوں نہیں؟

ان کے اس مجموعے میں نظموں اور غزلوں کے ماسوا آزاد شاعری کے بھی کچھ نمونے ہیں اور ایسے نمونے ہیں جن میں ان کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایسا نہیں کہ انہوں نے کہنے کا حق تو اپنے تک محفوظ رکھا ہو اور سوچنے سمجھنے کا حق اپنے قاری کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے سوچ سمجھ کر کہا ہے اور اس کا بیشتر حصہ وہ ہے جہاں معلومات نے محسوسات اور تصورات نے تاثرات کا رنگ اختیار کر لیا ہے، جس کے بغیر شعر نہیں بنتا۔ ورنہ محض کہی ہوئی بات ہی سننے کو ملتی ہے۔

مجموعے کا نام "خوں بہا" خود بھی ان کے ذہن کی کائنات کا ایک دلآویز عکس پیش کرتا ہے۔ اس میں شامل غزلیں اور نظمیں ہماری نئی زندگی میں تہذیبی اور فکری "خوں بہا" کی معنویت کی طرف قدم قدم پر اشارہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

تحریک اور تسلسل اگر زندگی کا قانون ہے تو تغیر و تجدید بھی اس کے لیے ایک جزو لاینفک ہے۔ وقت کے ساتھ نئی سوچ اُبھرتی ہے۔ نئے مسائل سامنے آتے ہیں۔ انسانی ذہن خود اپنی راہ میں نئے موڑ پیدا کرتا ہے اور ان سے گزرتا اور آگے بڑھتا ہے۔ تشنہ کی فکری زندگی میں بھی یہ موڑ آئے ہیں اور ان سے گزرتے ہوئے ان کا ذہن اپنی ایک داستان چھوڑ گیا ہے۔

ان کی شعری تخلیقات پر موجود سینہ میں اُن کے دستخط تو ہیں لیکن اُن کے زمانۂ تحریر یا تخلیق کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی بعض نظموں کے عنوانات اور بہت سے اشعار کی داخلی اور کہیں کہیں کوئی خارجی حوالہ یہ بتلا دینے کے لیے کافی ہے کہ یہ شعری تخلیق کس زمانے کی یادگار ہے اور شاعر کے ذہن اور زندگی کو کس واقعے نے اتنا متاثر کیا کہ وہ ان کے شعور و شعر میں داخل ہو گیا۔

سیاسی واقعات عام طور پر صحافتی اداریوں اور خبروں کا حصہ ہوتے ہیں لیکن کچھ سانحے، حادثے اور تاریخ ساز واقعے ہمارے تخلیقی عمل کو بھی مہمیز کرتے ہیں اور شعری تخلیقات کی صورت میں بھی اُن پر اپنے جذباتی ردِعمل کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ادب کے حوالے تاریخ میں موجود ہیں اور تاریخ کے حوالے بسا اوقات ادب سے اخذ کیے جاتے ہیں، اس لیے ایسی نظمیں بھی سرسری گزر جانے کی چیز نہیں ہیں۔ اصل سوال ان میں رچی بسی شعریت کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ زبانوں پر آنے کے ساتھ گویا وہیں دل میں اتر جاتی ہیں۔

کبھی کبھی لوگ یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ ملکی سیاست یا قومی زندگی میں اتنا اہم واقعہ گزر گیا اور شعری تخلیقات میں ہم اس کی کوئی صدائے بازگشت نہیں سنتے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے شعر و شعور سے وابستہ فرد زمانے کے دل کی دھڑکنوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بڑھے ہیں۔ لیکن "خوں بہا" میں شامل نظموں میں وقت کے دل کی ایسی دھڑکنیں موجود ہیں جہاں نوائے سروش صریرِ خامہ میں داخل ہو گئی ہے۔ ان نظموں سے اس احساسِ محبت اور اس خلوصِ خاطر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کے ساتھ ان واقعات پر نظر ڈالی ہے۔ ان نظموں کو پڑھنے اور ان سے اثر قبول کرتے وقت یہ سچائی بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ شاعر نے ان نظموں کو اسٹیج کے لیے نہیں لکھا ہے۔ اس نے اپنی تنہائیوں اور دل کی گہرائیوں میں ان واقعات کے تحت اثرات کو "آبی دائروں" کی طرح جنم لیتے اور وقت کی پہنائیوں میں آگے بڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور اسے قومی زندگی کی عقدہ کشائیوں سے تعبیر کیا ہے۔

اس کی ایک مثال "مبارکباد" عنوان کے ساتھ لکھی جانے والی نظم کے اشعار اور افکار میں بھی مل سکتی ہیں جو پنجاب کی زندگی کے کرب و اضطراب کے پس منظر سے اُبھرتی ہے لیکن اس موقع پر ایک اور نظم جو ان کے قلم سے نکلی اور

اپنے عنوان کے ساتھ ان کے شدید جذباتی ردِعمل کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ ملکی حقیقت کی ایک ایسی ہولناک تصویر ہے جس کے ہر رُخ پر ہماری قومی زندگی کی تاریخ لکھی ہوئی ہے اسے پڑھ کر حیرت ہوئی کہ تشنہ نے کس طرح ژرف نگاہی کے ساتھ وقت کی تاریخ کے یہ دونوں پنّے پڑھ لیے؟ اور ان کی ملکی حقیقت نگاری اپنے دونوں رُخوں کے ساتھ بے نقاب ہو گئی۔

پہلا رُخ جس کے ساتھ یہ عبارت ہے "نومبر ۱۹۸۲ء کو زندگی کے شکار ایک رفیوجی کیمپ سے متاثر ہو کر"

کیسے معصوم سے ہیں یہ معصوم نظریں
یہ ژولیدہ زلفیں، یہ پلکوں کے قلزم
یہ اُترے ہوئے چہرے
بڑھاپے کے ماتم گزیدہ دِنوں کے
اندھیرے
یہ سہمے ہوئے وقت کی تیرگی میں
جو خود بھی نہیں جانتے وہ کہاں ہیں
فقط ہیں پتا جانب آسماں ہیں
اگر پوچھ لیجے تو کچھ بات بنتی
بھلا اُن کے غم کا مداوا کرے
مگر پوچھ لیجے
کہ کٹتے ہیں کیسے شب و روز اُن کے

کس بلا کا تاثر ہے اس نظم میں کہ جیسے کیمپ کی ساری داستان ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اب ذرا دوسرا رُخ بھی دیکھیے کہ انسان اپنی عافیت کا خود بھی کتنا بڑا دشمن ہوتا ہے۔ خدا کی پناہ!

وہ ژولیدہ زلفیں وہ پلکوں کے قلزم
ہر شام ہمدم
کہاں تھے کہاں آ گئے ہیں
ابھی شام باقی ہے شب ہے اندھیری
کناروں کو ڈبویا ہے تم نے
مئے ناب کے نشے میں چُور ہو تم
تمہاری ضرورت کہاں جو پہلی تھی
پناہ مانگتی تھی مکانوں کے بدلے
بس ایک آشیانہ
مگر اب تمہاری وہ حاجت نہیں ہے
تمہاری ضرورت کہاں آن ٹھہری

یہ پروپیگنڈا نہیں، سماج میں اپنے لیے دوسروں کے سہارے کے مقام کی تلاش نہیں۔ یہاں تو حقیقتیں ہمارے شاعر کے سامنے آئینہ لیے کھڑی ہیں۔ یہ وہ سچائیاں ہیں جو کسی انکار و فرار سے ماورا ہیں اور اس لیے ہیں کہ وہ سچائیاں ہیں۔

یا زاویۂ نظم ہے مگر اس کی ہر سطر میں شاعر اور نئی تصویر کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ہم اس میں ردیف و قافیہ نہیں تلاش کرتے۔ گردون کی طرف ہمارا خیال منتقل نہیں ہوتا۔ وہ سماجی حقائق کی ایک بے لاگ تصویر ہے اور ہمیں بے اختیار اپنے حلقۂ تسخیر میں لے لیتی ہے۔ ان کے ذہن اور تخلیقی عمل اور ردِعمل میں قدروں کی شکست اور حقیقت کے المیے سے اہم زندگی کے دوراہوں پر اکثر دوچار ہوتے ہیں اور اس وقت ہمارے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ میں دل کی دھڑکنوں کا "عکسِ صدا" صاف جھلک اٹھتا ہے اور ہمارے دل کی بات خاموشی سے تشنہ کی زبان پر آجاتی ہے۔ انھیں اپنے فن میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا جانے کی شدید خواہش ہے جسے غالب نے یوں کہا ہے اور جسے آرزوئے ناتمام سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیالات جنھیں زندگی کے فلسفہ کا نچوڑ کہیے تشنہ کے ذہن پر مہ پاروں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "کیفِ لطیف" اور "سفر در سفر" اس نوع کی فکری کاوشوں اور نقش آرائیوں کی بہت عمدہ مثالیں ہیں:

علم پوشیدہ چٹانوں سے تراشا جائے
پھر نہاں خانۂ ادراک سے
یہ الفاظ
سایوں سے گزرتے جائیں
میں سوچتا ہوں
میں نے پا لی
ایک "اُس کی" جھلک

یہاں ان کا لہجہ کچھ نامانوس سا ہے۔ ہم الفاظ کا اور الفاظ ان کا ساتھ نہیں دے پاتے لیکن سچائی کی تلاش اور کثرت میں جو دھنک کے رنگوں کی حسین و جمیل جستجو ہے، ایک سادہ، بے رنگ و بے نمود شعاعِ نور کی تلاش میں لفظ و معانی کے دائرے سے باہر لے آتی ہے اور اپنی جگہ صرف ایک "اُس" بلکہ لطیف حسّیت چھوڑ جاتی ہے۔ "سفر در سفر" کے مفکرانہ عنوان پر توجہ دینے کے ساتھ یہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے:

اس بحرِ ہست و بود میں
جو بنی ہوئی نمود
گویا کہ ابتدائے دہر ہو ابھی نہیں ہوئی
اک کشتیِ حیات ہوئی تھی کبھی رواں

کرنے لگی ہو، محسوس کیے جانے کا اہتمام

یوں تو سبھی جانتے ہیں کہ زندگی آتی اور جاتی ہے لیکن آن اور اسی احساس فنا کے ساتھ اس کی پُر اسراریت کی ساری پرچھائیاں بھی گردش فانوس کی طرح اپنے "آواگون" کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل زندگی کی بھول بھلیوں کا سراغ بھی ہے اور ان میں سفر کی بھیدوں بھری داستان بھی ہے۔

انسان مرنے سے پہلے تک صرف ایک نہیں ہے "انیک" بھی ہے۔ اس کے شب و روز اس کو نت نئے حقائق سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ بڑے مسائل کے ساتھ چھوٹی چھوٹی سچائیاں اسے اپنی طرف توجہ کی دعوت دیتی ہیں بلکہ اسی کشاں کشاں رکھتی ہیں۔ تشنہ نے دونوں کو زندگی میں کرن سے اپنے ذہنی رشتے قائم کیے ہیں اور انھیں 'تا زہ بہ زہ روشنی' میں زندگی کو پایا اور پرکھا ہے۔ وہ آدمیت کے پرستار ہیں اور اس متاع نیک کو جہاں دیکھتے ہیں نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے جہاں بڑے لوگوں میں کچھ اچھے لوگوں کو سراہا ہے جن میں انھیں اچھائیاں نظر آئیں، وہاں انھوں نے ایسے لوگوں کو بھی اپنی ذہنی زندگی میں داخل کیا ہے جو دیکھنے میں تو اتنے بڑے نہیں تھے لیکن درحقیقت ان کی بڑائی میں کلام نہیں۔

چڑھتے سورج کی پوجا تو عام بات ہے لیکن بجھ جانے والے چراغوں کی روشنیوں کی یاد اور ان کی پرستاری کا تو پروانہ جاں سوز کے طواف شعلہ و رقص شرر سے بھی کچھ آگے کی بات ہے۔

ظفر ادیب مسکین طبیعت شاعر اور خاموش مزاج قلم کار ابھی کچھ دنوں پہلے ہی ہمارے درمیان تھے اور پھر اچانک سائے کی طرح گزر گئے۔ ان کے مرنے پر افسوس تو بہت لوگوں نے کیا اور اس احساس کے ساتھ کیا کہ ان کی زندگی گزر گزر کے چپ جانے کا نام تھی لیکن اتفاقاً کوئی نہ نکال سکا کہ ان کو یاد کرنے کے ساتھ ان کی ادبی خدمات کو بھی یاد کرے اور اس طرح یاد کرے کہ ان کا ذکر ہی ہماری ادبی تاریخ کے کسی گوشے کے لیے ایک ادبی دستاویز کی صورت میں محفوظ ہو جائے۔ تشنہ نے یہ کام انجام دیا اور اپنے روشن و شفاف ذہن کے ساتھ ان کی حیات اور ادبی خدمات پر ایک لائق تحسین کتاب لکھی ہے اور ظفر ادیب کی ایک شایان شان یادگار کی صورت میں اسے پیش کیا۔ اتنا ہی نہیں ظفر ادیب ان کی شاعرانہ فکر کا بھی ایک موضوع بن گئے۔ ظفر ادیب (ایک مختصر کیریکٹر اسکیچ) کے عنوان سے جو نظم ان کی شعری تخلیقات کے ساتھ موجود ہے وہ شخصی مرثیے کے ذیل میں تو آتی ہی ہے اس سے بھی کچھ بڑی بات ان کے منظوم سوانحی خاکے کو ان کی سیرت کے تانا بانا کے مرقعوں سے سجانا ہے جنھیں شعری فیچر بھی کہہ سکتے ہیں۔

پاک باطن اور دردمند شاعر ... ڈاکٹر مظفر حنفی

ہر زمانے میں سینکڑوں شعرا اکثر و بیشتر شعر و سخن کی آبیاری کرتے ہیں لیکن ان میں سے دو چار ہی ایسے ہوتے ہیں جو زمانے کی گرم و سرد سے بچ کر اپنے کو سلامت رکھ پاتے ہیں۔ مگر میرا یقین ہے کہ شعری روایت کو آگے بڑھانے میں نہیں دو چار اہم شاعروں کا ہی ہاتھ رہتا ہے۔ زبان و ادب کی نشوونما کا عمل بڑا پیچیدہ عمل ہے اس میں کون کب اور کتنا حصہ لے رہا ہے اس کا صحیح اندازہ لگانا بڑا دشوار ہے حقیقت یہ ہے کہ اکثر وہ شعرا بھی جن کا نام آج تک نہیں جانتے اور جن کے اشعار کو زیور طبع سے آراستہ ہونے کا موقع کبھی نہیں مل پاتا وہ بھی خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور انہیں بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر یوکمد کمال تشنہ بنیادی طور پر انگریزی کے آدمی ہیں اور انگریزی میں ان کی چند کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ اپنی بہر اردو حلقوں میں وہ غیر معروف نہیں کہے جا سکتے۔ ان کی شعری تخلیقات بھی اکثر رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ پچھلے دنوں نظر سے ان کی کتاب اردو میں شائع ہوئی تھی اور پسند بھی کی گئی۔ "...ہوا" موصوف کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ تشنہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنی کاروباری مصروفیات کے ساتھ شعر و شاعری سے بھی بے حد دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ باقاعدہ شعری تخلیق بھی کرتے ہیں۔

غزلوں کے علاوہ پابند اور آزاد نظموں کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تشنہ انتہائی پُرخلوص، پاک باطن اور دردمند انسان ہیں، پیار اور محبت ان کا ایمان ہے۔ بغض و حسد اور نفاق نفرت سے ان کا دل دُکھتا ہے۔ وہ اپنے وطن سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کے ان لطیف احساسات کی ترجمانی ان کی نظم "پیار کے دیے" سے پوری طرح ہو جاتی ہے۔ اس نظم کے توسط سے وہ سبھی کو پیغام دیتے ہیں:

انسانیت کا نور محبت کی روشنی
یادوں سے کم نہ ہو اِک پل کے واسطے

وہ جب دیکھتے ہیں کہ انسان آپس میں کٹ مر رہے ہیں۔ بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے تو ان کے دل کو بہت چوٹ پہنچتی ہے اور وہ اپنے آپ سے سوال کر بیٹھتے ہیں:

انساں کی سرشت ہے انساں دوستی
پھر کیوں ہیں دشمنوں کے یہ گلیوں میں قافلے

پیار سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں
پیار کی دولت سبھوں کو بانٹ دو
کیا دیا تم کو کسی نے بھول جاؤ
گزرے وقتوں کا کوئی بدلہ نہ لو

تشنہ کی غزلیں بھی ان کے انہی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں جہاں انہوں نے کلاسیکی روایات سے استفادہ کیا ہے وہیں عہد حاضر کے مسائل کی بھی عکاسی کی ہے۔ ہمارے سماج میں جو بے اعتدالیاں اور برائیاں در آئی ہیں اکثر اشعار میں تشنہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

دیتا نہیں مجرم کو سزا کوئی بھی منصف
بے جرم خطاکار ہوئے عہد میں تیرے
کہتے تھے جو غدار نگہبان وطن کو
وہ حاکم و سردار ہوئے عہد میں تیرے

ہر شخص مجھ کو وطن پر ہے گماں مقتل کا
ہر قدم راہ میں اِک سُولی گڑی ہے یارو

دور تک بھی رہیں وہ قندیلیں
راہرو ہر قدم بھٹکتے رہے

تشنہ جب دیکھتے ہیں کہ ان کے وطن کے لوگ اپنے ہی وطن کی ملکیت تباہ و برباد کر رہے ہیں، بینک لوٹے جا رہے ہیں، ڈاک گھروں اور اسٹیشنوں کو نذرِ آتش کیا جا رہا ہے تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں:

تمہارا پیار اگر اک سوال بن جائے
جلاؤ لوگو نہ اس طرح سے سفینوں کو
جو رزق دیتی ہیں سونا اُگلتی ہیں تشنہ
بنا رہے ہیں وہ بنجر انہیں زمینوں کو

تشنہ کی غزلوں میں روایتی غزل کے بعض عناصر بھی مل جاتے ہیں۔ خاص طور پر غم و اندوہ سے انہیں بے حد لگاؤ ہے:

آ جاؤ کہ پلکوں پہ روشن ہیں دیے کتنے
تازہ ہیں ابھی دل میں تم نے جو دیے تھے غم

ہم بہت نزدیک سے گزرے تھے لیکن بے خبر
اس کو میری جستجو تھی مجھ کو تھی اس کی تلاش

ایک پل بھی نہ راستے میں تھمے
پھر بھی اپنے سفر ادھورے تھے

ایک انسان جس کا دل پیار اور محبت سے لبریز ہو اور جو ہر انسان کی بھلائی چاہتا ہو اس کے لیے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔

اپنی دھرتی سے محبت ہے جنہیں اُن کے لیے
جان دینا بھی کوئی شرط کڑی ہے یارو

اس لیے تشنہ ہمت و استقلال اور جہد مسلسل کی تلقین کرتے ہیں:

آنکھ لگ جائے گی جس دن آپ کی
خواب جیسی کوئی شے چھن جائے گی

تشنہ جیسا محسوس کرتے ہیں اُسے سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں معنی کی پیچیدگی یا اُلجھاؤ قطعی نہیں ہے۔

کس جہاں میں ٹھکانا ہے

سلیم انصاری

تخلیق کار معاشرے کا ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو اپنے عہد کے مسائل و مصائب کو تخلیقی سطح پر محسوس کر کے انھیں اظہار کے نئے ذائقوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کرنے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ تشنہ ایک حساس انسان ہیں، بے حد جذباتی اور درد مند... لہٰذا ان کی شاعری میں اُن کے باطن کا عکس صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ کے گذشتہ شعری مجموعے ''خون بہا'' پر اپنی رائے درج کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ تشنہ کی نظموں کے موضوعات انسانی ہمدردی، امن و مساوات، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی سے عبارت ہیں، ان کی شاعری امن و محبت کی شاعری ہے، خلوص و ہمدردی کی شاعری ہے۔ اب جو ان کا تازہ شعری مجموعہ منظر عام پر آیا ہے تو مجھے اپنی رائے میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔

یوگیندر بہل تشنہ کا تازہ شعری اظہار ''پیاس کا صحرا'' ان کی شاعری کے نئے تخلیقی رویوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ''پیاس کا صحرا'' کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تشنہ نے اپنی شاعری میں نجی زندگی کے بے حد نازک اور غم دہ لمحوں کو بھی نہایت خلوص سے رقم کیا ہے۔ ان کے یہاں نظموں میں انسانی رشتوں کی دردمندیوں کو نہایت شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

تشنہ نے اپنی شریک حیات سدرشن بہل اور اپنے عزیز و اقارب کی دائمی مفارقت کو اپنی بعض نظموں میں بے حد ہنرمندی کے ساتھ رقم کیا ہے... ان کے یہاں ذہنی اور جذباتی وابستگی کے ذاتی تجربات کو تخلیقی سطح پر رقم کرنے کی ہنرمندی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ۳ نومبر ۱۹۹۳ کو اپنی شریک حیات سے دائمی طور پر بچھڑنے کے بعد حالانکہ تشنہ نے تنہائی اور بے یقینی کے لمحوں میں اپنے اندر کے بکھرنے اور ٹوٹنے کے عمل کو شدت سے محسوس کیا لیکن تخلیقی سطح پر انہوں نے اپنے ذاتی رنج و غم اور تنہائی کو نہایت کامیابی سے شعری پیراہن عطا کیا ہے.... ''پیاس کا صحرا'' کی تمام تر تخلیقی اکائیوں میں یوگیندر بہل تشنہ غم ذات کو غم کائنات میں تبدیل کرنے کے عمل میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اپنی شریک حیات کی رحلت کے فوراً بعد یعنی اسی دن انہوں نے جو اشعار قلمبند کیے ان میں تخلیق کا ایک نیا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔

آئی جو شام اور اندھیرا بڑھا دیا
دل کا چراغ دستِ اجل نے بجھا دیا

دنیا میری اُجاڑ کے تنہا کیا مجھے
قسمت نے میرے حق میں عجب فیصلہ دیا

تیرے بغیر زندہ رہوں زہرِ غم پیوں
اے دائی عدم یہ وفا کا صلہ دیا

رشتوں کا اعتبار نہ چاہت کا اعتبار
تشنہ بچھڑ کے اس نے بھی کچھ سمجھا دیا

ان اشعار میں اپنی رفیق حیات سے تشنہ کی ذہنی/جذباتی وابستگی کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آخری شعر میں ایک طرح کی جھنجھلاہٹ ہے جو رشتوں اور چاہتوں کے بے یقین ہو جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن اس جھنجھلاہٹ میں بھی محبت کی شدت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ نے اپنی شریک حیات کی دائمی مفارقت کے حوالے سے کئی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ جن میں دائمی مفارقت، آنسوؤں کے پھول، میرا درد، درد تنہا اور اے جان تو جب سے چھوڑ گئی وغیرہ نظمیں موضوعات اور زبان و بیان دونوں اعتبار سے خاصی اہم ہیں...

۳ نومبر ۱۹۹۳ء اور اس کے بعد تخلیق کی گئی نظموں میں تشنہ کے یہاں جدائی کے درد کی شدت میں کمی نظر آتی ہے اور اپنی شریک حیات کی یادوں اور رفاقتوں سے جڑنے کی خواہش کا اندازہ ہوتا ہے.....

کان میں گونجتی ہے تمہاری صدا
ڈھونڈتی ہے خلاؤں میں تم کو نظر

کس جہاں میں ٹھکانہ ہے یہ تو کہو
یا ابھی تک سفر میں ہو اے ہمسفر

(آنسوؤں کے پھول)

ہر کوئی مصروف یہاں پر کس کو دیکھے کس کو سنے
اتنی فرصت کس کو ہے جو کوئی کسی سے بات کرے

روز کے معمولات میں ذرہ بھر بھی کسی کے فرق نہیں
میری طرح گھر بھر میں کوئی میرے غم میں غرق نہیں

کس کو دل کے داغ دکھاؤں کوئی مرا غم خوار تو ہو
کون سنے گا میرا نوحہ کوئی مرا دلدار تو ہو

ان اندھیاروں میں بھی تشنہ وہی دیپ جلاتا ہے
آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن یاد تو آتا ہے

(دھڑکنوں کے جھروکوں سے)

میرا غم اب تیرا غم ہے تیرا درد اب میرا درد
روٹھ گیا غم بانٹنے والا کون آئے گا سمجھانے کو

کل کی بات ہے اس کا کہنا لیکن ایسا لگتا ہے
جیسے صدیاں بیت گئی ہوں ٹوٹے اس یارانے کو

جب جب دل میں درد اٹھا ہے یاد کئی ہو آئے بہت
فکر نہیں ہے پر تپش غم کی اپنے اور بیگانے کو
(مہر اور دُور رچہا)

یوگیندر بہل تشنہ نے اپنی شریکِ حیات کے علاوہ اپنے عزیز و اقارب کے بچھڑنے کو بھی تنہا بے شدت سے محسوس کیا ہے اور اپنے زخموں کو کئی نظموں میں تخلیقی سطح پر پیش بھی کیا ہے۔ اپنے بڑے بھائی رام پرکاش بہل کی موت پر ان کے تاثرات کچھ یوں ہیں:

دور تک پھیلا سمندر ہے نظر کے سامنے
آدمیوں کا ہے اک انبوہ گھر کے سامنے

پھر بھی میں تنہا ہوں کوئی بھی مرا ہمدم نہیں
میرے زخموں کا کسی کے پاس بھی مرہم نہیں
(ہوس)

ماتا جی کی رحلت پر یوگیندر بہل تشنہ کا تخلیقی ردِ عمل کچھ یوں ہے:

اٹھ جائے جب سر سے سایہ پیار بھرے ہاتھوں کا
بیٹھ کے یادوں کے جھرمٹ میں دل اپنا بہلانا

بھولیں جب نینوں سے تارے سوکھے پیار کی گنگا
دیکھ کے من درپن میں بکھرا اپنا روپ سہانا
(یوگی جی)

اپنے عزیز دوست خان علی خاں مرادآبادی کے انتقال پر بھی یوگیندر بہل تشنہ نے ایک طویل مرثیہ "نور کی وادی" کے عنوان سے تخلیق کیا ہے جو ان کی کتاب پیاس کا صحرا میں شامل ہے۔ جس کے بارے میں قابلِ ذکر شاعر و ادیب عشرت قادری کا خیال ہے کہ "نور کی وادی" مرنے والے کی مفارقت پر محض اظہارِ افسوس یا اس کے غم میں آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو ہی نہیں ہیں بلکہ یہ حیات بعد الممات اور موت کے بعد روح کے سفر کی ایک ایسی داستان بھی ہے جو موت و زندگی کے فلسفے کے عجیب و غریب پہلوؤں کو دردناک انداز میں پیش کرتی ہے۔

نور کی وادی پر اتنے compact تبصرے کے بعد میرے نزدیک کسی طرح کی خیال آرائی بے سود ہے.....

پیاس کا صحرا میں یوگیندر بہل تشنہ کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ ان کی غزلیں حالانکہ کسی مخصوص ذہنی رویئے کی طرف اشارہ نہیں کرتیں تاہم یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تشنہ اپنی نظموں کی طرح غزلوں میں بھی امن و مساوات، بھائی چارگی، انسانی ہمدردی، قومی یکجہتی اور حب الوطنی کی طرف دار نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی غزلیں ان کے دامنِ غم کا آئینہ ہے۔ اپنی تنہائی اور درد کو انہوں نے اپنی تخلیق کا source بنالیا ہے لیکن یہ بات بھی اہم ہے کہ وہ بعض جگہ اپنی تنہائی اور درد سے برسرِ پیکار بھی نظر آتے ہیں... غزلوں میں اپنی نظموں کے برعکس تشنہ خواب دیکھتے اور ان کی تعبیروں کو تلاش کرنے کے عمل سے بھی گذرتے ہیں لیکن کہیں کہیں ان پر اپنی شریکِ حیات اور عزیز و اقارب کی دائمی جدائی کا کرب غالب آنے لگتا ہے۔

ان کا ملنا اب تو ہے خواب و خیال
دے گئے جو داغ دل کو دائمی

خود سے ہیں بیزار دنیا سے گریز
کون سی منزل ہے یہ احساس کی

چلتے پھرتے چند سائے آنکھوں میں کچھ صورتیں
جب بساط الٹی تو دیکھا یہ جہاں کچھ بھی نہ تھا

اس محفلِ ہستی میں تصویرِ وفا کیا ہے
اک شخص کے اٹھنے سے کچھ بھی نہ نظر آئے

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ تشنہ کے یہاں خواب دیکھنے کا عمل بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جو خواب تراشے تھے اپنے تو نہ تھے وہ خواب
کتنے ہی جتن کیجے تعبیر نہ بن پائے

وہ خواب کیا خواب تھا جو میری نیند لے اڑا
تمام رات جاگنے کی دے گیا مجھے سزا

یہ اور بات ہے کہ تو نہ میرا ساتھ دے سکا
میں خواب خواب تیرا ہاتھ مانگتا رہا

رات کچھ ایسے خواب دیکھے ہیں
جیسے پھولوں سے شعلے لپٹے ہیں

یوگیندر بہل تشنہ کی شاعری ایک ایسے شخص کی زندگی نامہ ہے جو زندگی کے حقیقی مسائل و مصائب سے دوچار ہے۔ جو سچائیوں سے آنکھیں ملا کر سچ بولنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ تشنہ کی شاعری کے موضوعات اپنی زمین سے وابستہ ہیں.... مجموعی اعتبار سے ان کی شاعری ادب برائے زندگی سے عبارت ہے۔ ان کے یہاں بعض دیگر شاعروں کی طرح مبہم علامات و استعارات نیز پیچیدہ فکر سے بھرپور شاعری نہیں ہے۔ جس کے سبب ترسیل کے المیہ کا شکار نہیں ہے۔ البتہ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ تشنہ کی شاعری براہِ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور قاری کو اپنی مٹی اور اپنی زمین سے ہم رشتہ رکھتی ہے۔

زندگی کو خطروں کا سامنا

وشوناتھ طاؤس

عربی فارسی اور اُردو عالمِ مشرق کی تین بڑی زبانیں ہیں لیکن تینوں کا مزاج مختلف ہے۔ عرب کے اہلِ قلم احساسِ برتری میں مبتلا ہیں اور گرچہ اکثر اکیات کرتے ہیں۔ وہ عربوں کو علوم و فنون کا موجد سمجھتے ہیں اور اُن کے نزدیک باقی دنیا عجمی ہے۔ فارسی کے فنکار پلکیں جھکا کر بات کرتے ہیں کہ عجز و انکسار اُن کی تہذیب و ثقافت کا بنیادی عنصر ہے۔ انھیں اپنی فنی صلاحیتوں پر ناز ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ رستم و سہراب سے بڑی داستان آج تک دنیا میں نہیں لکھی گئی ہے مگر وہ متکبر نہیں ہیں۔ اُردو والے کمر تک جھک کر بات کرتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں قدیم ہی کو انسانیت کا شرف اور عجز کو اخلاق کی معراج سمجھا گیا ہے۔ یہاں پانے کی بجائے کھونے کی اہمیت زیادہ ہے اور ہارنے والا بھی جیتنے والے کو داد دیتا ہے۔ یہ فرق میں نے اس لئے واضح کیا ہے کہ ان زبانوں کی کسی صنف کا جائزہ لیتے وقت یہ پس منظر پیشِ نظر رہے اور حقائق کی نشاندہی کرنے میں دشواری نہ ہو۔

مشرق کی دیگر زبانوں کی طرح اُردو نثر کا آغاز بھی تخیلاتی اور طلسمی داستانوں سے ہوا۔ ان داستانوں کا کل فتح کوہ قاف کوہ بے ستون سے لے کر کالے سمندروں، جادوئی غاروں، غیر آباد جزیروں اور بے آب و گیاہ ریگزاروں تک محیط تھا۔ ایک طرف سحری اور شیطانی قوتیں تھیں تو دوسری طرف محبت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے شہزادے اور پری زادیاں۔ ان مافوق الفطرت کرداروں کا جو غیر معمولی ماحول بنا ہوتا تھا حقیقت نگاری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قدیم عربی ادب میں سحری کرداروں کو فوقیت حاصل ہے اور فارسی میں رومانیت کا عنصر حاوی ہے۔ اُردو نے چونکہ ان دونوں زبانوں کا زیادہ اثر قبول کیا لہٰذا اس نے سحریت و رومانیت یہ دونوں مزاج اپنے اندر سمو لئے۔ خون کا بدلہ خون کا نظریہ ہمارے ہاں کبھی پنپ نہیں سکا اس لئے اتنا فرق ضرور رہا کہ یہاں عشق نے فاتح کی بجائے مفتوح اور حسن نے سرنگوں ہونے کی بجائے زیرِ نگیں ہونا زیادہ پسند کیا۔ اُردو زبان مادرِ ہند کے بطن سے پیدا ہوئی اس لئے رحم و کرم اور ایثار و قربانی سے لبریز ہندوستان کے مخصوص مزاج کا اثر اس پر بھی پڑا۔ ان اوصاف نے اُردو کے حسن کو نکھارا اور دیگر زبانوں سے ممتاز کیا۔ داستانیں جب اوراقِ پارینہ بن گئیں اور اُردو افسانے کا آفتاب طلوع ہوا تو یہی بنیادی اوصاف اسے ورثے میں ملے۔

اُردو افسانہ طلسماتی ماحول سے نکل کر جب دوسرے دور میں داخل ہوا تو ہندوستان کلاسیکی نظام میں پرورش پا رہا تھا۔ عیش پرست مہاراجے نواب اور جاگیردار طوائفوں کے کوٹھے آباد کر رہے تھے اور ان کے شب و روز جام و مینا اور گھنگروؤں کی جھنکار میں ڈوبے رہتے تھے۔ برسوں تک اُردو افسانہ انہی کرداروں سے آراستہ رہا۔ جاگیردارانہ نظام کا زور ٹوٹا تو یہ کردار بھی ماند پڑ گئے۔ ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے اُردو افسانہ منشی پریم چند کے دور میں حقیقت نگاری کے میدان میں داخل ہوا۔ پریم چند کے کردار ہمارے معاشرے کے وہ لوگ تھے جو برسوں تک ظلم کی چکی میں پستے رہے اور جنھیں اُف تک کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جن کی تمنائیں مسل دی گئی تھیں اور جن کے ارمان سسک سسک کر دم توڑ چکے تھے۔ منشی پریم چند نے ان کرداروں کو قوتِ گویائی اور طاقتِ پرواز بخشی۔ میری دانست میں اُردو افسانے کی اس سے بھی زیادہ خدمت پنڈت سُدرشن نے کی۔ انھوں نے سماج کے متوسط طبقے کو موضوع بنا کر جو افسانے لکھے وہ حقیقت کے زیادہ قریب ہیں۔ مزدوروں، کسانوں اور دیگر محنت کشوں کا چاہے جتنا استحصال ہوا ہو ہمارے سماج کا سب سے مظلوم حصہ یہ متوسط طبقہ ہے جو ظاہری رکھ رکھاؤ کا شکار ہے اور جس میں آہ تک بھرنے کی ہمت نہیں۔ پنڈت سُدرشن کے رتبے کو اگرچہ اُردو دنیا نے پوری طرح تسلیم نہیں کیا مگر جو روش وہ متعین کر گئے ہیں وہ آج بھی قابلِ تقلید ہے۔

اس صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں اُردو افسانہ عروج پر پہنچا تو اس کے کرداروں میں انقلابی تبدیلیاں آ گئیں۔ اس نے اپنا روایتی خرقہ اُتار پھینکا اور فولادی خول پہن لیا۔ کئی بین الاقوامی نظریات کی چھاپ ہمارے افسانوی کرداروں پر پڑی۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے افسانوی کرداروں میں رنگینی کی بجائے حالات کی سنگینی زیادہ ہے۔ ان کے ہر کردار پر کسی نہ کسی نظریے کی چھاپ دکھائی دیتی ہے لیکن اس دور کے بعض افسانہ نگاروں نے سنگینی سے اپنا دامن بچا کر رکھا اور اپنے کرداروں پر کسی مخصوص نظریے کی مہر نہیں لگنے دی۔ وہ مخصوص ہندوستانی مزاج کے بھلے چنگے کرداروں سے ہی اپنے قارئین کی دلجوئی کرتے رہے۔ اس صف میں ایم اسلم، کوثر چاند پوری، آ سی رام نگری، راجہ مہدی، امتیاز علی اور شوکت تھانوی کے نام نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر جوگیندر پال، تشنہ بھی فنکاروں کے اسی کارواں کی ڈگر پر چلتے نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے کرداروں میں مخصوص ہندوستانی مزاج کو برقرار رکھا ہے۔ تشنہ صاحب کا ذہن چونکہ کسی خاص نظریاتی بوجھ سے آزاد ہے اس لئے اُن کے مرکزی کردار نہ تو کسی انقلابی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، نہ وہ رجعت پسندی اور دہشت گردی کا شکار ہیں اور نہ ہی سراسر یاسیت اور محرومیت کے جال میں جکڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے وہ کردار وضع کئے ہیں جنھوں نے سو فی صد ہندوستانی جامہ پہن رکھا ہے اور جو آپ کو ہر نکڑ، ہر شہر اور ہر گلی کوچے میں چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ ان کرداروں کو ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ یہ زندگی کے ہر راستے، ہر موڑ اور ہر منزل پر آپ کو دکھائی دیں گے۔ ان کرداروں کی حرکات و سکنات اور

بول چال میں سادگی ہے اور اسی وجہ سے یہ فطری اور حقیقی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ کیریکٹر ہیں جو عوام سے بلند و بالا نظر نہیں آتے بلکہ ہمارے معاشرے کا ایک جزو دکھائی دیتے ہیں۔ تشنہ صاحب کا یہی ہندوستانی پن انہیں ایک روز افسانہ نگاری کی معراج پر لے جائے گا۔

ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ کی شخصیت گونا گوں محاسن و خصائل اور بے شمار خوبیوں وصفات کی پیکر ہے۔ ایسے جامع صفات لوگ اُردو ادب نے بہت کم پیدا کئے ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ جو لوگ انہیں شاعری حیثیت سے جانتے ہیں انہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی شاعری کی کوئی چھاپ اُن کے افسانوں پر نظر نہیں آتی۔ دونوں اصناف میں اُنہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ جہاں وہ شاعری میں اسرار و معارف کے موتی بکھیرتے ہیں وہاں اُن کے افسانے اُن کے رشحات فکر کی پیداوار ہیں۔ انتہائی اُلجھے ہوئے حالات میں بھی وہ ایک مخصوص لہجے میں اس طرح قلم آرائی کر جاتے ہیں کہ الفاظ کی ترتیب، جذبہ اور انداز بیان ہر پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ عوام کی پسند جاننے کے معاملے میں وہ ایک مشاق اور چابکدست قلم کار ہیں۔

معاشرے کے ہر گروہ سے تشنہ صاحب کا رابطہ رہا ہے۔ وہ عرصہ میں رہے انہوں نے تجارت اختیار کی۔ وہ تجربات کے کثیر کیکٹر ہے 'اُن کا واسطہ کیمیکلز سے رہا۔ وہ کئی سماجی وفلاحی تنظیموں اور ادبی و ثقافتی جماعتوں سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ان کا مطالعہ و مشاہدہ دونوں وسیع ہیں۔ اُن کے اس مجموعے کا پہلا افسانہ "ملاقات" غالباً اُن کی اپنی ہی زندگی کے کسی واقعہ کی غمازی کرتا ہے۔ ہیرو یوگیندر کی ملاقات ایک اجنبی لڑکی سے ہوتی ہے جو ریڈیو پر ہے۔ دونوں کی منزل الگ الگ ہے لیکن تھوڑا سا فاصلہ وہ ایک ساتھ طے کر رہے ہیں۔ کچھ رسمی گفتگو کے بعد وہ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ لڑکی کو جب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نوجوان ہمسفر ایئر فورس میں کام کرتا ہے تو وہ کہتی ہے ہوائی جہاز کا کام بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس پر یوگیندر جواب دیتا ہے "زندگی کو خطروں کا سامنا کرنا پڑے تو بہتر ہے اُس زندگی میں کیا لطف، جس میں خطرہ ہی نہ ہو۔ کشتی کو بھنور سے گزر کر ہی پتہ چلتا ہے کہ بھنور کیا شے ہے"..... یہ بے ساختہ جواب وہی شخص دے سکتا ہے جسے زندگی کی مشکلات کا بخوبی علم اور خطروں سے گزرنے کا عملی تجربہ ہو۔

یوگیندر اور اجنبی لڑکی کی یہ مختصر ملاقات پھر ملنے کے وعدے پر ختم ہو جاتی ہے مگر لڑکی انتظار کا درد دے کر چلی جاتی ہے اور پھر کبھی نظر نہیں آتی۔ یوگیندر کو اب تک اس کا انتظار ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا ملنا محال ہے۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ زندگی بھر کسی کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ پردہ گرنے کے بعد منظر بدل جاتا ہے اور زندگی کے سفر میں جو مقام گزر جاتے ہیں وہ پھر نہیں آتے۔

"بیگنگی" کا مصنف تشنہ لب ضرور ہے لیکن وہ ہنگامہ خیزی کا قائل نہیں اور نہ بے جا جوش و خروش پیدا کرنے کا متمنی نظر آتا ہے۔ تشنہ کے سامنے چند اہم مقاصد ہیں۔ جب کسی مسئلے پر لکھتے ہیں تو اس کے تمام پہلوؤں کو جانچ لیتے ہیں، حقائق کی چھان بین کرتے ہیں اور پھر معاملے کی تہہ تک پہنچ کر قلم اٹھاتے ہیں۔ اپنے افسانے "سسکیاں" میں ایک فوجی جوان اور اُس کے بھائی کی زندگی کا المیہ بیان کیا ہے جسے ڈیوٹی سے غافل رہنے کے باعث کورٹ مارشل سے موت کی سزا سنائی جاتی ہے اور گولی ماردی جاتی ہے۔ اس افسانے سے ظاہر ہے کہ مصنف نے فطری کیمپس کی زندگی اور ماحول کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور اسے کورٹ مارشل کے سنگین ضابطوں کا علم ہے۔ اُنہوں نے موت کا انتظار کر رہے اس فوجی جوان کے جذبات کی تصویر کشی اس فطری انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والے کا دل بھر آتا ہے۔

ہر فنکار اپنے دور کا ادبی مورخ ہوتا ہے اس لئے اُسے روز مرہ کے واقعات سے ابھرنے والے حقائق اور اُن سے اخذ ہونے والے نتائج کا صحیح اندازہ کرنا ہوتا ہے۔ جناب تشنہ کا دائرہ نظر کتنا وسیع ہے یہ اُن کے افسانے "مجبور" سے ظاہر ہے۔ اس افسانے کا ایک کردار لاغر اور بوڑھی بھکارن ہے جس کی پکار کوئی نہیں سنتا۔ بھکارن کی حالت زار وہ یوں بیان کرتے ہیں۔ "میں بیٹھی بھوکی رہی ہوں، میری تھیلی پر کسی نے ایک پیسہ نہیں دھرا اس لئے کہ میں بوڑھی ہوں۔ اگر جوان ہوتی تو زردار حسن پرستوں کی للچائی ہوئی نظریں میری جانب اُٹھ جاتیں، ہر کوئی میرے قریب بیٹھ کر باتیں کرتا اور میری جھولی روپوں سے بھر جاتی۔" ایک جوان اور بوڑھی بھکارن کا فرق افسانہ نگار کے وسیع مشاہدے کی گواہی دیتا ہے۔ یہ بوڑھی بھکارن ہندوستان کے صدیوں پرانے افلاس کا ایک مسلسل کردار ہے جو زبان حال سے وطن کی بے بسی اور زرداروں کی بے حسی کی داستان سناتا ہے۔ اس بھکارن کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ پتھر کی لکیر ہے جس کے مٹنے کی کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

تشنہ صاحب کی برجستہ بیانی اور الفاظ کی روانی اپنی مثال آپ ہے۔ اسلوب کی کرشمہ سازی اور اظہار مطالب کے لئے اُن کا دلکش لہجہ انہیں بعض دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ "ادھورے سپنے" میں انہوں نے ایک ویران خانقاہ کی منظر کشی بڑے جاندار انداز میں کی ہے اور الفاظ کا خوبصورت جال بُنا ہے۔ لکھتے ہیں "ہم چاہتے تھے کہ محبت کی یہ گھڑیاں کبھی ختم نہ ہوں مگر کون کبھی خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اب تمام دن یکساں کبھی تو نہیں ہوتے..... وہ حسین دن جلدی بیت گئے ہماری محبت کا جنازہ اُٹھا تھا کشتی نے اپنا رخ بدل ڈالا اور منجدھار کی طرف چل پڑی۔ طوفانوں کے سائے گھیرے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور کشتی ہچکولے لگانے لگی۔ ارمانوں نے سسک سسک کر دم توڑ دیا' آرزوئیں ختم ہو گئیں اور ماضی کی داستانیں ایک یاد بن کر رہ گئیں..... یہ ادھوری

تمناؤں اور اکام محبت کی بہت ہی دلگداز منظر کشی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کورت کی کوئی قلم پردے پر چل رہی ہو۔

افسانہ "سلاخوں کے پیچھے" ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو دفتر میں بابو بننے کی خواہش لے کر شہر آتا ہے مگر اُس کی آرزو پوری نہیں ہوتی۔ حالات کی گردش اُسے رکشا چلانے پر مجبور کر دیتی ہے اور پھر ایک سنگدل انسان اُسے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچوا دیتا ہے جہاں سے وہ اپنی ماں کو چاند کی روشنی میں ایک درد بھرا خط لکھتا ہے۔ جیل کے بھیانک ماحول کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے کس قدر حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ یہ اس کی تحریر کے ایک ٹکڑے سے ظاہر ہے "ہمیں یہاں رات کو بتی جلانے کی اجازت نہیں۔ یہاں دن ڈھلتے ہی بتیاں گل کر دی جاتی ہیں اور شام کے دھندلکے ابھی مکمل طور پر دن کے اُجالے پر غالب نہیں آئے ہوتے کہ اندھیرا کر دیا جاتا ہے" ہمارے ہاں جیلوں کا ماحول ایسا ہی ہے۔ نجانے کس پتھر دل انسان نے جیل خانوں کے قواعد و ضوابط وضع کیے تھے جن کی اصلاح کا کوئی وسیلہ ہی نظر نہیں آتا۔ بجلی اگر آ بھی گئی ہے تو جیل کا تاریک ماحول کسی طرح جاتی ہے"

مجھے تشنہ صاحب کے افسانوں میں "دکھ بھرا تبسم" سب سے زیادہ پسند آیا ہے کیونکہ اس قسم کے کئی کرداروں سے میرا بھی واسطہ پڑا ہے۔ یہ ایک ایسی ٹیچر کی کہانی ہے جس کے حُسن کی جاذبیت اور شباب کی کیف آگیں ساعتیں رُخصت ہو رہی تھیں اور پاؤڈر کریم سے چہرے کی زیبائش کے باوجود کسی کی نگاہ اُس پر نہیں پڑ رہی تھی۔ جب وہ جوان اور خوبصورت تھی عزیز و اقارب کے لاکھ سمجھانے پر بھی اُس نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا.... وقت گزرتا گیا۔ اب اُس کی جوانی کی شوخی مدھم پڑنے لگی تھی اور کوئی اُس کا دامن تھامنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُسے جیون ساتھی نہ مل سکا اور وہ دل شکستہ ہو کر سگریٹ اور شراب پینے لگی تھی۔

پھر ایک عجیب اتفاق ہوا کہ اُس سے شادی کرنے کے لئے اُس سے کم عمر کا ایک نوجوان تیار ہو گیا لیکن اُستانی کے اخلاق نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنے جذبات کی آسودگی کے لئے ایک کمسن لڑکے سے شادی کرے۔ اُستانی کا یہ کردار آپ کو ہر گرلز اسکول یا لیڈیز کالج میں نظر آئے گا جہاں کوئی نہ کوئی ٹیچر یا پروفیسر اسی طرح اکیلے زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ جوانی کی بھول پر آنسو بہاتی ہے اور اُن دنوں کو یاد کرتی ہے جب بھنورے اس کے گرد منڈلاتے تھے اور وہ انہیں خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اب اُسے بھنوروں کا انتظار ہے جب کہ پھولوں کی رنگت اُڑ چکی ہے اور ہری پتیاں مرجھا چکی ہیں۔ راقم کو ایسی کتنی ہی بے حال اُستانیوں کا حال معلوم ہے جو گزرے وقت کو یاد کر کے تکیے کے نیچے سر چھپائے چپکے چپکے رولیتی ہیں۔ بڑی دیر بعد انہیں احساس ہوتا ہے کہ زمستانِ شباب حیات کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اسی طرح تشنہ صاحب کے بعض دوسرے افسانے بھی دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں اور اُن کے کمالِ فکری کی داد دینی پڑتی ہے۔

انتظار

یوگندر بہل تشنہ

مجھے بخار کی ایک وجہ سے شکایت ہے اور میں ہسپتال میں پڑا سوچ رہا ہوں..... اُس کے بارے میں جسے دیکھنے سے مجھے قرار آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے میرے بخار کا باعث وہی ہو جس کا مجھے ہمیشہ انتظار رہتا ہے..... سو تے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے وعدہ تو کیا تھا اُس نے مگر میں کیا کروں جبکہ اُس کے وعدے کے علاوہ بھی بے شمار ساعتیں گذر چکی ہیں..... آٹھ دن..... ایک سو بانوے گھنٹے..... لیکن میں پھر بھی اُس کا منتظر ہوں۔ میری صرف یہی تمنا ہے کہ اُسے ایک بار دیکھ لوں..... فقط ایک بار..... اور بس.....!!!

میں سوچتا ہوں کہ میرے انتظار کے آخری پیمانے بھی چھلک جائیں اور وہ نہ آئے..... بیمار جسم میں تشنگی ہو جائے اور میں اُس کا منتظر رہوں کیا عورتیں اس قدر بے وفا ہو سکتی ہیں لیکن نہیں..... وہ جفا نہیں کر سکتی..... وہ کتنی بھولی تھی..... لیکن سیدھی سادی.....!!! اُس کے متعلق ایسا خیال کرنا بھی ایک گناہ عظیم کرنا ہے..... ایک عظیم گناہ.....!!!

سوچ ہی رہا تھا کہ میرے شانوں پر کسی نے اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھا۔ میں چونکا شاید 'وہی' ہو مگر میرا خیال خام تھا۔ نرس میرے پاس کھڑی مجھے دوائی پینے کو کہہ رہی تھی اور مجھے چونکتے دیکھ کر اس نے کہا "میڈ یسن پلیز" اور اُس نے دوا کا پیالہ اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں پکڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔ اور میں نے لرزتے ہاتھوں سے اُس پیالے کو تھام لیا اور غٹ غٹ کر پی گیا "دوا کڑوی ہے..... تلخ بھی نہیں ہے.....!"

"ہاں....."

"آپ کو جلدی آرام ہو جائے گا" اور مجھے کہنے لگی "مسٹر تم ہر وقت کچھ سوچتے رہتے ہو..... کیوں.....؟ تم کیا سوچتے ہو.....؟ تمہاری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی ہیں.....؟"

"نہیں میں کچھ نہیں سوچتا..... میں کسی خیال میں کھویا نہیں رہتا.....!!! مگر تمہیں یہ کیونکر محسوس ہوا کہ میں کھویا رہتا ہوں..... سوچتا رہتا ہوں۔ البتہ مجھے انتظار ہے..... ایک عجیب شے کا..... جس کی ملاقات ایک حادثہ ہے..... ایک عجیب حادثہ..... اور میں کہنے لگا..... "میرا اُس سے چند گھنٹوں کا میل رہا..... اندھیرے میں..... اس دوران میں..... میں اُسے نہ دیکھ سکا..... ہو سکتا ہے میں نے دیکھا ہو..... ضرور دیکھا ہوگا۔ تبھی تو میں اسی کے چہرے کو تکتا رہا..... میں نے ضرور دیکھا ہوگا.....!!!

ہاں.....! ان چند گھنٹوں کے ملاپ میں میرے اور اُس کے درمیان بہت سی باتیں ہو گئیں..... اُس نے مجھے اپنے بارے میں کچھ بتایا اور میں نے کچھ اُسے بتایا..... اسی ملاپ سے ہم ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہو گئے..... اسی لئے تو میرے سے فوٹو کا البم لے گئی تھی..... اور مجھے کہا تھا کہ میں چند ایک تصویریں لینا چاہتی ہوں..... ورنہ وہ ایسا کیوں کہتی..... ضرور اُسے مجھ سے محبت ہو گئی..... ضرور ہو گئی ہو گی..... ہاں..... جاتی دفعہ وہ اتنا ضرور کہہ گئی تھی کہ وہ کل میرے پاس آئے گی..... میرے پاس..... میرے دیئے ہوئے پتے پر..... لیکن وہ کل نہیں آئی..... میں ہمیشہ اُس کا منتظر رہتا ہوں۔ نہ جانے کب کل آئے گا..... ہمیشہ چوبیس گھنٹے کے بعد کل آتا ہے مگر نہیں جانتا کہ میرے کل کے درمیان کتنے گھنٹے ہوں گے..... میں اُس کے خیالوں میں اکثر کھو جاتا ہوں..... ہمیشہ میں اس کا منتظر رہتا ہوں جس نے میری زندگی میں ارتعاش پیدا کر دیا..... "انتظار..... "نرس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور اتنا کہہ کر باہر نکل گئی..... "دیر ہو رہی ہے..... پھر کبھی..... میں جاتی ہوں....." وہ چلی گئی اور میں پھر دروازے کی جانب تکنے لگا۔ اور میرا ہاتھ تکیے کے نیچے کچھ ڈھونڈنے لگا..... اور پھر..... میرے ہاتھوں میں ایک کاغذ کا پرزہ لرزنے لگا..... اور میں کہہ اٹھا..... "وہی..... بالکل وہی..... ایک غیر فانی خاکہ....." تصویر پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا سب کچھ ہی تو دیکھ رہا تھا اُس خاکے میں..... جیسے وہ میرے لئے آئینہ سکندری ہو..... میں دیکھنے لگا۔ صدر بازار..... پولیس سٹیشن..... سی او ڈی..... وہ گاؤں..... اور دور ایک طرف ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے..... اور وہ ایک صدر دروازے سے اندر گھس رہی ہے..... اپنے مکان میں..... اور پھر مجھے اُس کی کہی ہوئی باتوں کا خیال آنے لگا..... وہاں..... جہاں ایک چراغ جل رہا ہے..... وہاں ہے ہمارا مکان..... مگر میں بیسیوں بار تب وہاں گیا لیکن وہ مجھے نہ مل سکی.....

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھایا..... "ہیلو..... کون صاحب ہیں....."

"میں..... سروپ کہو کیسی طبیعت ہے اب"

"میں ٹھیک ہوں.....!"

"کیا بات ہے کتنی مردہ دلی سے جواب دیا ہے کوئی تکلیف ہے..... ضرورت ہے کسی شے کی کیا.....؟؟"

"نہیں..... نہیں..... مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"

میں تمہارے پاس ابھی آ رہا ہوں اپنے ہمراہ پھل وغیرہ بھی لیتا آؤں گا....."

"نہیں..... اس کی کوئی حاجت نہیں..... مت لانا۔"

مگر وہ ٹیلیفون بند کر چکا تھا اور غلطی سے ریسیور میز پر ہی رکھ دیا..... کوئی نیا دہ انتظار نہ کیا۔ سروپ لمحوں کے وقفے کے بعد میرے پاس آ گیا اور میری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ بہت دبلے ہو گئے ہو..... دیکھو برا نہ منانا یوگندر تو ایک بات کہوں..... اگر میں غلطی نہیں کرتا تو میرے خیال میں اس بخار کا باعث اندر کا انتظار..... ہے.....!!!"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو..... بالکل ٹھیک..... بہت حد تک ہو

سکتا ہے کہ اندرا کا انتظار ہی ہو..... اُس نے میری زندگی میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے۔ اور تو میں سب کچھ سنا چکا ہوں فقط اتنا ضرور کہہ دیتا ہوں کہ مجھے اُس کا ہمیشہ انتظار رہتا ہے..... اتنا ختم کے بعد وہ کہنے لگا۔ آخر تمہیں اُس کا اتنا کیوں انتظار رہتا ہے۔

وہ چند گھڑیوں کے لئے تمہاری زندگی میں آندھی کی طرح آئی اور طوفان کی طرح چلی گئی۔ اپنے پیچھے کی طرف تو دیکھو کتنا مرجھا گیا ہے..... پھر بھی تمہیں اُس کا انتظار ہے..... کچھ بھی تو تمہیں اُس کے بارے میں علم نہیں میرا خیال ہے جو پتہ اُس نے تمہیں دیا ہے وہ ضرور غلط ہے..... تمہارے ساتھ ایسے کیا اُنس ہو سکتا ہے..... وہ جوان ہے..... اُس کی زندگی میں بے شمار ہی نوجوان آئے اور..... چلے گئے ہوں گے۔ تمہارا خیال ہے کہ وہ میری ایک کی طرف متوجہ ہوتی ہو گی۔ ناممکن ہے۔ اگر میری مانو تو اُس لڑکی کا خیال چھوڑ دو۔ وہ تمہیں نہیں ملنے کی..... اور یہ کیا.....؟"

اُس نے میری میز پر پڑی ہوئی چند ایک چیزوں کو دیکھتے ہوئے کہا..... "نیند کی..... گولیاں..... یوکھندر..... تم اتنی جلدی پر جا چکے ہو کہ اگر تجھے ہستی کا خیال دلاؤں تو تم ہنس کھا جاؤ گے..... کہیں ایک دن پاگل نہ ہو جاؤ..... اُس کو اپنے جی سے نکال دو..... تم پاگل ہو جاؤ گے..... پاگل..... تم کو بخار کی شکایت ہے..... تمہارا چہرہ مرجھا گیا ہے تمہاری آنکھیں نیند کے باعث بوجھل ہو چکی ہیں۔ تمہیں نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ہے تم اُس کے انتظار میں دیوانے بنے پھرتے ہو..... تمہارے بال اُلجھے ہوئے ہیں..... اور ایک مدت ہو چکی ہے تمہیں شیو بنوائے۔ آخر اس طرح جا پاگل پن سے کیا مل جائے گا تمہیں..... ذرا خیال کرو..... ساٹھ روپے کے کلرک ہو..... کلرک.....!! اور پھر ایک امیر زادی..... بھلا تم سے اُس کا میل ہی کیا..... "

"ہاں ہاں..... یہ سب ٹھیک ہے مگر مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"یہ مجھ سے پوچھتے ہو.....؟"

"تو اور کس سے پوچھوں.....؟"

"اچھا تو کان کھول کر سن لو..... تم اُسے بھول جاؤ..... اور یہی سمجھ لو کہ وہ تمہیں کہیں ملی ہی نہیں..... "

"مگر کیسے.....؟"

"کیسے کا سوال نہیں.....؟ طریقے بتانے سے کیا ہو گا.....؟..... بس تم اُس کا خیال چھوڑ دو..... میں چلا..... مجھے کسی کے ہاں جانا ہے..... "

اور وہ چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نرس کے بعد ایک لڑکی آئی..... اور میں بے اختیار کہہ اُٹھا..... اِندرا..... تم..... یہاں..... "اور وہ نزدیک آ کر کہنے لگی..... ہاں..... میں تمہیں ملنے آئی ہوں..... "

"کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا..... "

"نہیں یہ حقیقت ہے..... "

"کیسی ہو..... "

"تم اپنی سناؤ۔ بہت کمزور ہو گئے ہو..... کتنے روز سے بخار کی شکایت ہے..... "

"سات روز سے..... جس دن سے تم مجھے اکیلا چھوڑ کر گئی ہو اسی دن سے مگر ہسپتال میں سات روز ہی ہوئے ہیں..... وعدہ پر کیوں نہیں آئی تھیں..... میں ہر گھڑی تمہارا منتظر رہا..... "

"وقت ہی نہ مل سکا آج بھی نہ آتی مگر آپ کی خوش قسمتی سے آپ نے ٹیلیفون کا ریسیور میز پر ہی رکھ دیا اور میں نے تمہاری تمام گفتگو سن لی جو تم اپنے دوست سے کر رہے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تمہیں میرا بہت انتظار ہو گا..... مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میرا بہت زیادہ انتظار کرنا پڑا۔ میں خوش ہوں کیا تمہاری آنکھیں انتظار کرتے کرتے تھکی نہیں..... آخر کوئی تو میرا انتظار کرتا ہے..... "

"کون ہے وہ.....؟"

"تم..... اور کون.....؟"

"تم کتنی اچھی ہو..... اندرا..... کتنی اچھی ہو تم.....!!!"

"اوہ.....! معاف کرنا تمہاری فوٹو البم تو میں لانا بھول ہی گئی..... اچھا کل لیتی آؤں گی"

"کل..... " میں نے تعجب سے کہا..... "تمہارا کب "کل" آئے گا..... دیکھو جلدی لانا ایسا نہ ہو کہ روح پرواز کر جائے اور تم کو میں آخری بار نہ دیکھ سکوں..... "

"نہیں ایسا نہیں ہو گا..... تم بے فکر رہو..... اچھا میں جاتی ہوں..... دیر ہو رہی ہے"

اور وہ بھی چلی گئی..... نرس..... سروپ..... اِندرا..... سب ہی چلے گئے کوئی بھی تو نہ رہا..... اب میں کمرے میں اکیلا تھا بالکل اکیلا.....

..... میں سوچنے لگا۔ شاید خواب دیکھا تھا اندرا نہیں آئی ہو گی مگر جب نرس نے آ کر کہا..... "یہ کون تھی..... " تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اندرا ہی تھی.....

سپنے اور حقیقت..... زمین و آسمان کا فرق ہے دونوں میں..... زمین و آسمان..... میں نے سگریٹ کا لمبا کش لگا کر دھوئیں کو خلا میں چھوڑ دیا اور آسمان کی جانب تکنے لگا کل..... پرسوں..... ترسوں..... وہ ابھی تک نہیں آئی..... رات کا وقت اور آسمان ستاروں سے جگمگا رہا ہے..... اور میں انتظار کر رہا ہوں..... گھڑی بھر کے لئے میری آنکھیں ایک غیر فانی خاکے کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور میں دیکھنے لگا کہ اندرا..... سی ہو ڈی کی اسی سڑک پر سے گزر رہی ہے..... راستے سے ناواقف..... مگر رات کی گہری سیاہی میں اُسے کوئی بھی نہ مل سکا..... وہ ایک سکراتی اور اُس کا یہ ہلکا سا تبسم میری زندگی کے تاروں کو جھنجھناتا ہوا چلا گیا..... اور میں پھر انتظار کرنے لگا..... انتظار!!

پلکوں پہ روشن دیئے

بعد اشتیاق

مصطفیٰ ملک

عزیز مکرم آپ کا مجموعہ خوں بہا موصول ہوا۔ ممنون و مسرور فرمایا۔ آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن اس مجموعہ کو پڑھ کر جو نقش آپ کی شخصیت کا قائم ہوا اس کی دل نوازی اور وضع داری میں شبہ نہیں۔ اس میں انسانیت کا نور، محبت کی روشنی بھی ہے اور دردمندی اور وطن دوستی بھی۔ یا یا ایں دارد و آں نیز ہم۔ خدا کا شکر ہے ہندوستان کی خاکستر میں ابھی چنگاریاں موجود ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی

برادر عزیز تشنہ جی! خوش رہیے!

میرا آج کا بیشتر وقت آپ کی رفاقت میں ہی بیتا ہے۔ "خوں بہا" میں آپ کا سچائیوں کا راست بیان بڑا سلیس، حسن بھاون اور اثر آگیں ہے۔ تامل سے تغزل کا امکان تو زیادہ ہوتا ہے۔ تاہم بے تامل، راست لہجے سے بات زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے اور اپنی پوری ہیئت میں دیکھتے ہوئے بہت بھلی معلوم ہوتی ہے اور سیدھی دل میں راہ کرتی ہے۔

جوگندر پال

"خوں بہا" کی بیشتر نظمیں براہ راست لب و لہجے کی وجہ سے انتہائی وقتی موضوعات کی عکاسی کرتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ حالات کی تبدیلی کے بعد ان نظموں کی وقعت کم ہو جائے گی۔ ایک بار روس کا کوئی شاعر اسی طرح کی ایک نظم پڑھ رہا تھا جس میں علاقے کی زبوں حالی کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ نظم کے اختتام پر شاعر سے سوال کیا گیا کہ علاقے کی زبوں حالی ختم ہو گئی تو نظم کی کیا اہمیت رہے گی۔ جواب میں شاعر نے کہا "کم از کم میری نظم اس بات کا ثبوت تو دے سکے گی کہ اس وقت میرے علاقے کی حالت بہت زبوں رہی ہے۔" یہی کیفیت تشنہ کی نظموں میں بھی پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے عہد اور گرد و پیش سے کبھی غافل نہیں رہے۔ یہی ان کے اخلاص اور دیانت داری کا ثبوت ہے۔

پروفیسر عذیر اندوری

احساس کی صلیب کا شاعر یوگیندر بہل تشنہ

جب شدت احساس کے عالم میں اپنے ارد گرد کے دلدوز و دلسوز حالات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کو پوری دنیا غم و الم میں ڈوبی، روتی، چیختی اور چلاتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے، روح بے چین ہو جاتی ہے اور وہ ذہنی کرب و اذیت میں اس قدر مبتلا ہو جاتا ہے کہ اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے اور وقت کی تیرہ و تاریک راہوں میں جب وہ امید بھری کسی ہلکی سی کرن کی تلاش میں نکل پڑتا ہے تو اس کے تشنہ لبوں پر ایک اور صرف ایک ہی سوال ہوتا ہے!

"کیا دور حاضر میں عالمی بھائی چارہ، باہمی خلوص، بے غرض دوستی، بے نفسی، امن و آشتی، شرافت اور انسانیت کے قتل کا کوئی خون بہا ہے؟ اگر نہیں! تو اس دنیا میں نہ سہی لیکن اس دنیا کے بعد جو دنیا آتی ہے اس میں یقیناً مظلوموں اور مظلوموں کے لئے انصاف ہے اور بے گناہ مقتولوں کے لئے "خوں بہا" بھی!

"خوں بہا" تشنہ کے کچھ ایسے ہی پریشان خیالات کا مجموعہ ہے جس میں دور حاضر کی انسانی خونچکاں داستان منہ سے بولتی ہوئی سنائی دیتی ہے اور جس پر صداقت زبان و حقیقت بیان کی آواز بازگشت کا یقین ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کامل قریشی

ڈاکٹر یوگندر بہل تشنہ کا زیر نظر دوسرا شعری مجموعہ "خون بہا" ان کی سرگذشت بھی ہے اور مشاہدات و تجربات کی طویل مسافت میں شب و روز گذرنے والے لرزہ خیز خونچکاں حادثات و اندوہگیں واقعات کی پُر درد حکایت بھی۔ ان کی شاعری میں ہجرت کا المیہ جس داخلی کرب اور شدت احساس کے ساتھ ابھرتا ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ انہوں نے اپنی زمین سے کٹ کر بے وطنی کی اذیت جھیلی ہے۔

تشنہ فطری طور پر نظم کے شاعر ہیں یہی وجہ ہے کہ "خوں بہا" میں ان کا شعری رویہ احساس کی صلیب سے مختلف ہے۔ اس انتخاب میں تشنہ کی بیشتر نظموں کے موضوعات انسانی تہذیب کا زوال، استحصال اور استحصال کے علاوہ عالمی طور پر پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ آتش فشاں کے وہ شرارے ہیں جو دھرتی کی کوکھ کو کھا جانے کے درپے ہیں۔

ڈاکٹر یوگندر بہل تشنہ اپنے پہلو میں ایک دردمند اور حساس ترین دل رکھتے ہیں۔ انسانی مساوات، مذہبی رواداری اور نیک نیتی ان کی فطرت و مزاج ہے اور یہی ان کی شاعری کے حقیقی محرکات ہیں۔

وہ اپنے افکار، خیالات اور محسوسات کو بغیر کسی تراش خراش کے

شعری پیرائے میں ڈھال دیتے ہیں یوں بھی شاعری میں فکر و نظر کا سلسلہ تخلیقی عمل کے بہت بعد تک جاری رہتا ہے اور کئی پہلو قاری کی نظر میں جا کر کھلتے ہیں۔

تاہم "خوں بہا" تشنہ کی ادبی شناخت کا اعتبار دلاتا ہے۔ ان کے فن میں جذبے کی سرشاری ہر ذہن و دل کو متاثر کرتی ہیں۔

عشرت قادری

تشنہ صاحب ایک ذہین، باشعور، حساس اور صاحب بصیرت انسان ہونے کی وجہ سے ان کا اپنا ایک فکری نظام ہے جس میں ربط بھی ہے اور تنوع بھی ہے۔ اس نے ان کی شاعری کو طرح طرح کے خوبصورت رنگوں سے سجایا ہے۔ وہ ایک انتہائی مہذب اور شریف النفس انسان ہونے کے ساتھ تمام اصناف سخن پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے قدیم اور جدید ادب کا گہرا مطالعہ بھی ان کے فنی سفر میں معاون رہا ہے۔ انہوں نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر سچے دل اور سچے جذبوں کی شاعری کی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

ہجرت کا دکھ اور تنہائی کا کرب تشنہ کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ زندگی اور دوست داری کے رشتوں کے تلخ تجربات اور کئی احباب کی رحلت نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا اور انہیں تنہائی پسند بنا دیا ہے اور کچھ دیر کے لئے انہوں نے چند ذاتی تجربات اور مشاہدات کو اپنی شاعری کی اساس بھی بنالیا تھا۔ اس لئے ان کی فکر ایک مخصوص دائرے میں گردش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ غزل اور نظم دونوں اصناف میں اظہار کی قدرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے نثری نظمیں بھی کہی ہیں جو زیادہ تر ہنگامی موضوعات سے متعلق ہیں۔ کہیں کہیں رومانیت اور کہیں روحانیت کا عنصر بھی جھلکتا ہے جو اب ان کے لئے قصۂ پارینہ ہے۔

انیس دہلوی

تشنہ صاحب کے یہاں شاعرانہ لطافت اور نازک خیالی کے باوجود اشتراکی اور سامراجی نظام نیز سرمایہ داری نظام اور اقتدار کی ہوس کے خلاف لطیف کنائے میں طنز و استہزا موجود ہے۔ وہ رمز و ایمائیت کی زبان میں کبھی کبھی حقیقت بیان کر کے ایک نیا شعری پیکر تراش کر زورِ دار اب بنا دیتے ہیں۔

پروفیسر انیس سلطانہ

اردو شاعری کی تشنہ لبی کو دور کرنے کے لئے تشنہ کا رول بہت اہم رہا ہے۔ یہ بات جدا کر ان کے ادبی مقام کو جانچنے پرکھنے کے حوالے سے قاریں صلحت کا شکار رہے تشنہ ہندوستان کے ان بلند نگاہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے زمین کی تقسیم کو انسانوں کی تقسیم سے جدا رکھا۔ ان کا دل ہر دو جانب بسنے والے انسانوں کی مداح سرائی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتا۔

دلیپ بادل

تشنہ کا اسلوب انتہائی سلیس و سادہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ ہندی الفاظ کا استعمال ایسی چابکدستی سے کرتے ہیں کہ اشعار کے حسن و خوبی میں نکھار آ جاتا ہے۔ اپنے احساسات خیالات اور جذبے میں چھپا درد غزل اور نظم کے ذریعے جس طرح تشنہ صاحب نے لوگوں تک پہنچایا ہے اس طرح کا سلیقہ اور قرینہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ ان کے افسانوں کی بڑی خصوصیت بھی یہی ہے کہ خواب و خیال کی سیر کرانے کے بجائے احساس کی لذت سے آشنا کرا کے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

محمد متین رائے بریلوی

تشنہ کی نظمیں افقِ ادب پر چاند سورج کی طرح چمک رہی ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس میں ظلم کی سیاہی کو مات ہوتی ہے یا جذبوں کے چاند سورجوں کو گہن لگتا ہے۔ تشنہ نے جہاں بات کو اشاروں کنایوں میں سمجھایا وہیں کھل کر اور صاف صاف اور کبھی کبھی تو برملا بھی کہنے سے نہ چوکے ان کی نظم "دھرتی کی چیخ" کا ایک شعر سنیئے:

ہمارا دشمن ہمارے اندر پنپ رہا ہے
بنا ہے وہ سانپ آستیں کا

تاباں ضیائی

جوانی کے آغاز میں عشق و محبت کی داستانوں نے تشنہ کے دل پر بہت اثر کیا۔ علمی تربیت کے مواقعوں نے سید اور شعری کو جاگر کیا۔ جس کے باعث اُن کے شعری رویوں میں محبت مندی اور پاکبازی کے احساسات نمایاں ہیں۔ بے لاگ روانی اور اظہار واقعیت کا اظہار ان کے ہاں بڑے دلکش انداز میں پایا جاتا ہے جس سے منظر کشی کا میلان مکمل طور پر اشعار میں واضح ہو کر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

عرفان انصاری

تشنہ صاحب کی شاعری کو فنی نقطہ نظر اور صرف و نحو کی میزان پر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ قاری کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ تشنہ کی شاعری برائے شاعری نہیں ہے۔ ان کی شاعری برائے زندگی ہے جس نے اپنے احساس کی

شدت سے ایک زمانے کو متاثر کیا ہے۔

رضا رامپوری

"احساس کی صلیب" تشنہ صاحب کی ایسی تخلیق ہے جو ان کے احساسات اور جذبات کی بھرپور ترجمان ہے۔ تشنہ کی اس تخلیق کو اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے تشنہ صاحب کی جس قدر بھی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی جائے وہ کم ہے کہ تشنہ کی شاعری سچے انسانی احساسات کی سچی شاعری ہے جس کے مطالعے سے انسان کے دل و دماغ میں خوشیاں رقص کرنے لگتی ہیں۔

لطیف انجم

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ مشہور ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یوں تو ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن میرے سامنے اس وقت ان کی دو ہی کتابیں ہیں۔ ایک "تشنگی" جو ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے دوسری کتاب "پیاس کا صحرا" ہے جو نظموں کا انتخاب ہے۔ "پیاس کا صحرا" میں ایسی دل ہلا دینے والی نظمیں ہیں کہ کوئی بھی حساس شخص ان نظموں کو پڑھنے کے بعد آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس کتاب میں یوں تو ان کے بہت سے دوست احباب کے انتقال پر کہی گئی نظمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ متاثر کرنے والی نظمیں ہیں وہ ان کی شریک حیات سدیش بہل کی یاد میں ہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک لفظ میں شاعر نے اپنا دل نکال کر پیش کر دیا۔

محمد توفیق خان

تشنہ صاحب مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کو مشاعروں میں پڑھتے دیکھا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو اردو والوں سے بچا کے رکھا اور ہمیشہ اردو کے شیدائی اور بے لوث خدمت گزار کے طور پر سنجیدہ کام کو فوقیت و اہمیت دی ہے۔

ایم حبیب خان

تشنہ کی شاعری پاکیزہ جذبات کی آئینہ دار ہے۔ مبتذل اور رکیک قسم کے مضامین سے انہوں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ تشنہ طبعی اور فطری طور پر متین، سنجیدہ، پاکیزہ اور سلجھا ہوا شعور رکھتے ہیں جس سے ان کے کلام میں توانائی، وسعت و رفعت، افادیت، وزن و وقار، سوز و گداز اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ عصری رجحانات سے آگہی، سماجی اور مثبت قدروں کا احساس و احترام ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

تشنہ صاحب ممتاز شاعروں میں سے ہیں جو اپنے لہجے سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں جو دھیما پن اور سوز و گداز کی زیریں لہر محسوس ہوتی ہیں وہ محض اتفاقی بات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تشنہ صاحب انسانیت سے درد کا سچا رشتہ محسوس کرتے ہیں۔ ان میں انسانی رشتوں کے درد کو محسوس کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں ایسی فضا ملتی ہے جو وسیع و عریض بھی ہے اور ہماری بصیرت و بصارت کے لئے ایک امتحان کا مرحلہ بھی پیش کرتی ہے۔

مترگوردی

یوگیندر بہل تشنہ اردو کے ایک گمنام شاعر ہیں۔ ان کی اس کامیابی میں اس بات کا بڑا دخل ہے کہ وہ ایک انتہائی مرنجاں مرنج قسم کے انسان ہیں۔ شاعری کی جانب ان کا رویہ نہ تو پیشہ ورانہ ہے اور نہ وہ کوئی بہت بڑے خلاق ہیں۔ وہ ایک تہذیبی روایت کے امین ہیں۔ زندگی کا ادب سے کوئی رشتہ ہے اور جو ہونا چاہیئے تو وہ تشنہ کی شاعری میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک کامیاب اور بھرپور زندگی کی چاہت میں انہوں نے ان گنت تشنگیوں کا زہر پیا ہے اور اتنا پیا ہے کہ وہ اس سے سیراب نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم پرویز

تشنہ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا انکشاف مجھ پر چند سال پیشتر ہی ہوا ہے۔ ہر چند وہ چالیس سال سے اپنی نمائندہ شاعری سے جام پر جام لنڈھا رہے ہیں بیشک! تشنہ آج ادبی دنیا میں گوشہ نشین سہی لیکن "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کے مصداق دور حاضر کے سنگ ریزوں اگر ان کی حیثیت ایک گوہر آبدار کی ہے تو جس وقت جوہریوں کی نظر ان پر پڑے گی تو یقیناً ان کی قدر افزائی ضرور کی جائے گی۔

ڈاکٹر کامل قریشی

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ اردو ادب کے ایسے بے مثال و بے مثل قلم کار ہیں کہ اگر ان کا اوڑھنا بچھونا ادب ہوتا یعنی عشق کے ساتھ معاشی بھی جڑا ہوتا تو ان کا شمار اردو ادب کے ان بلند قامت تخلیق کاروں میں ہوتا جن کے دم قدم سے گلشن ادب جھلملائی ہوتی ہے۔ خدا جب بزرگ ان کے قلم کی سچائی اور ان کے قلب کی شفافی کا کچھ حصہ بھی ان کی برادری کو بخش دیتا تو یہ گلشن کس قدر دلکش ہو اٹھا ہوتا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مشکور حسین یادؔ

اپنا کلام سُنائیں کس کو جرأت وقت الگ ہے کھڑی
آئینہ دکھلائیں کس کو صورت وقت الگ ہے کھڑی

کون ہے بات زبان پہ لائے کون ہے پوری ذات جلائے
حرف کی حُرمت تو حاوی ہے ہمتِ وقت الگ ہے کھڑی

مانا لسان تو سان پہ ہے ہی تیغ اپنی آن پہ ہے ہی
قامتِ قول کہاں لے جائیں قرأت وقت الگ ہے کھڑی

دست و پا کی روانی بھی تو ایک عجیب کہانی سی ہے
جادۂ جدت تو جاری ہے جودت وقت الگ ہے کھڑی

اُس کے حُسنِ حوالوں کو بھی دیکھنے والا دیکھتا ہے
خون پسینے میں کیوں لت پت محبتِ وقت الگ ہے کھڑی

دست و گریباں ہونے میں تو سب کے سب شامل ہیں مگر
پوری طرح دامن کو بھر کر قسمتِ وقت الگ ہے کھڑی

اپنے عزم کا فیصلہ دیکھو قدرت کے ہاتھوں میں ہے یادؔ
ہم ہیں بہائے سعی کے پیچھے قیمتِ وقت الگ ہے کھڑی

محسن احسان

پھر ایکبار اُس کروفر سے باہر آ
ہے انتظار میں سب شہر گھر سے باہر آ

کبھی تو سُن دلِ انساں کی دھڑکنیں وہ اعظ
کبھی تو وسوسۂ خیر و شر سے باہر آ

مرے سوا تجھے اہلِ جہاں بھی دیکھ سکیں
حریمِ دل سے حدودِ نظر سے باہر آ

چھٹے جو گرد تو میں تیری شکل پہچانوں
سفر گزیدۂ غبارِ سفر سے باہر آ

تری صدا بھی کھلے آسمان میں گونجے
فسونِ گنبد و دیوار و در سے باہر آ

تجھے میں ساحلِ امید پر بھی دیکھ سکوں
لیکن دیدۂ تر، چشمِ تر سے باہر آ

زمیں کو دیکھ کبھی آسمان سے محسنؔ
طلسم حلقۂ شام و سحر سے باہر آ

جاوید شاہین

دیکھنا کیا ہے بچا کیا ہے نظارے کے لیے
آنکھ وا رکھتا ہوں بس ایک گذارے کے لیے

کھول دے رازِ فلک کوئی زمیں پر آ کر
عین ممکن ہے کسی شب کسی تارے کے لیے

مَیں نے دیکھا ہے کئی بار کہاں رات کی موج
خود بناتی ہے جگہ صبح کے دھارے کے لیے

سردیاں سخت ہیں اور گیلا ہے خاشاکِ بدن
کام مشکل ہے ذرا دل کے شرارے کے لیے

چشمِ مدہوش کو اس درجہ بھی غافل نہ سمجھ
کھلتی رہتی ہے مطلب کے اشارے کے لیے

توڑ دیتی ہے یہ ساحل کا کوئی گہرا سکوت
مستی موج خرابی ہے کنارے کے لیے

اے مرے وقت کے دریا یہ جو ہے پاٹ ترا
چھونا پڑ جائے گا چڑھتے ہوئے دھارے کے لیے

غور سے دیکھ ذرا، تو نے پکڑ رکھی ہے
کوئی گرتی ہوئی دیوار سہارے کے لیے

کس لیے جنسِ وفا مفت میں دے دوں شاہیں
یہ دکاں کھولی نہیں مَیں نے خسارے کے لیے

اکبر حمیدی

یہ مَیں کس شہر کے نواح میں ہوں
روز و شب جیسے قتل گاہ میں ہوں

وقت نے جیسے نظریں پھیر لی ہیں
اور مَیں کوششِ نباہ میں ہوں

راستے بند ہوتے جاتے ہیں
اور مَیں منزلوں کی چاہ میں ہوں

کچھ اندھیرے ہیں کچھ اجالے ہیں
جیسے میں تیری خوابگاہ میں ہوں

اتنے نادم ہیں دیکھتے بھی نہیں
یوں تو ہر شخص کی نگاہ میں ہوں

بچ نکلتا ہوں ہر بلا سے اگر
اے خدا میں تری پناہ میں ہوں

کچھ عجب حال ہے مرا اکبر
جیسے میں غیر کی سپاہ میں ہوں

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

جو اپنے سلسلے سے کٹ گیا ہے
ہزاروں ٹکڑے میں وہ بٹ گیا ہے

وہی مرکز سے اپنے ہٹ گیا ہے
قبیلوں میں جو انساں بٹ گیا ہے

پرندو آشیانوں سے تو نکلو
فضا گہری اندھیرا چھٹ گیا ہے

وہ شخص آسمانی تو نہیں تھا
زمیں سے اس کا رشتہ کٹ گیا ہے

جو پتہ شاخ سے اپنی گرا ہے
گلستاں کی نظر میں گھٹ گیا ہے

میں آہن تو نہیں لیکن مرے ساتھ
وہ مقناطیس بن کر سٹ گیا ہے

ہزاروں پست سے جو ماتواں تھا
پہلواں کے مقابل ڈٹ گیا ہے

زمیں اس کی فطرت تو نہیں تھی
وہ اپنے قد میں شاید گھٹ گیا ہے

نئی شاخوں پہ جب بھی پھول دیکھے
ستاروں سے وہ رستہ اٹ گیا ہے

وہ بچہ امتحان کے موسموں میں
کتابوں کے ذخیرے رٹ گیا ہے

بہت اچھے گھرانے کا تھا لیکن
وہ دستر خوان سارے چٹ گیا ہے

وہ خونیں انقلاب اب چاہتا ہے
رہِ حق میں جو حق پر ڈٹ گیا ہے

ہماری عمر کو کیا پوچھتے ہو
قمر بھی گھٹتے گھٹتے گھٹ گیا ہے

کشش صورت کی اس کی کچھ نہ پوچھو
اُدھر جو بھی گیا ہے سٹ گیا ہے

وہ دو بیٹوں کے بٹوارے میں آخر
پسر کے درمیاں خود بٹ گیا ہے

جہاں جب جس میں آئی خود ستائی
وقار اس آدمی کا گھٹ گیا ہے

اسی کی ذات ہے مشکوک عاشق
روایت سے جو اپنی ہٹ گیا ہے

رند ساغری

ہر نفس تار تار چاہتا ہوں
زندگی سے فرار چاہتا ہوں

ہو رہی ہے خلوص کی توہین
پھر اَنا کا سنگار چاہتا ہوں

چاندنی کی طلب بھی ہے لیکن
دھوپ بھی بے شمار چاہتا ہوں

کچھ رُتیں ہر طرف پریشاں ہیں
خوشبوؤں کو قرار چاہتا ہوں

غم کی مشعولیت کا شغل رہے
مستقل روزگار چاہتا ہوں

رَت جگے کھو گئے اندھیرے میں
روشنی کا دیار چاہتا ہوں

دھوپ میں چھاؤں سوکھ جائے گی
بادلوں کی پھہار چاہتا ہوں

زندگی کی دکان سے اے رندؔ
چند لمحے اُدھار چاہتا ہوں

شاہد واسطی

آئے گا وہ، عمر بھر یہ ایک ہی وعدہ رہا
میں بھی اتنی بات پر اس شخص کی زندہ رہا

ایسا کب ہے میں شبِ تاریک میں بیٹھا رہا
اک چراغِ آرزو تو مستقل جلتا رہا

کس طرح اس سے گلہ دردِ جدائی کا کروں
میں خود اپنے آپ سے اکثر جدا ہوتا رہا

اُڑ گئے سارے پرندے آب و دانے کے لئے
اک پرندہ شاخ پر تنہا مگر بیٹھا رہا

کچھ نہ ہو پایا شجر کی چھاؤں سے بھی دوستو
آگ کیسی تھی کہ پورا جسم ہی جلتا رہا

سوچ کی لہریں برابر ذہن میں اُٹھتی رہیں
دل میں بھی بہتا ہوا تخلیق کا دریا رہا

فاصلہ رکھنے کا شاہد واسطی دونوں کے بیچ
یہ حقیقت ہے کہ اک خاموش سمجھوتہ رہا

عبدالرحمان عبد

بشر محسوس کر سکتا ہے دل میں حُسنِ یزداں کو
مگر توفیق یہ ملتی نہیں ہر ایک انساں کو

ہے کس میں تاب دیکھے آنکھ بھر کے مہرِ تاباں کو
مگر اب کون سمجھائے مرے شوقِ فراواں کو

جہادِ زندگی میں یہ بھی اِک طرزِ عبادت ہے
لَبِ خنداں رَفو کرتے رہو چاکِ گریباں کو

اسیری میں مجھے اتنی سی مہلت بھی غنیمت ہے
کبھی چاکِ قفس سے دیکھ لیتا ہوں گلستاں کو

کھڑے ہیں منتظر راہوں میں تیری ایک مدت سے
ہمارا کیا سنوارے جاؤ تم زلفِ پریشاں کو

خدا جانے وہاں لیلیٰ کے دیوانے پہ کیا گزری
کوئی پوچھے خبر کچھ قیس کی ہو گی بیاباں کو

ہوئے ہیں اس جہاں میں خوب سے بھی خوب تر پیدا
ضرورت پڑ گئی بلقیس کی تختِ سلیماں کو

خدا رکھے مری دنیا میں پھر تازہ بہار آئی
دعائیں دے رہا ہوں رات دن ابرِ و باراں کو

گلہ کس بات کا اے عبدؔ یہ اعزاز کیا کم ہے
ملا جامہ سخن کا تیرے افکارِ پریشاں کو

علیم صبا نویدی

میں چپ رہوں تو کوئی مجھ میں بولنے لگتا
رموزِ گہری خموشی کے کھولنے لگتا

سنہرے فن کا پرندہ زمیں پہ آتے ہی
اُڑان کے لئے پر اپنے تولنے لگتا

عجب تھا اُس کا کرشمہ عجب تھا اُس کا وجود
نشہ لٹا کے فضاؤں میں ڈولنے لگتا

نگاہِ خنجر قاتل کو رکھ کے آگے وہ
مٹھاس زہر کے پیالوں میں گھولنے لگتا

صبا نویدی سا مدہوش ہوش میں رہ کر
نہ جانے کس کو وہ ہر سو ٹٹولنے لگتا

سرورانبالوی

آئینہ جسے دیکھ کے حیراں سا لگے ہے
انساں ہے مگر مہرِ درخشاں سا لگے ہے

کھلتا نہیں آسیب کا سایہ ہے کہ کیا ہے
اس دور کا ہر شخص پریشاں سا لگے ہے

جو شہر ترے دم سے تھا فردوس بداماں
بن تیرے وہی شہر بھی ویراں سا لگے ہے

پابند نہیں حسن حجاباتِ نظر کا
اور عشق بھی اب شعلہ بداماں سا لگے ہے

جو گر گئے راہوں میں انہیں مڑ کے نہ دیکھا
اب کس لئے رہبر یہ پشیماں سا لگے ہے

اب کوئی شناسا بھی نہیں ملتا ہے باہر
اور اُس پہ ستم گھر بھی تو زنداں سا لگے ہے

اب بھی جو گزر کوچے سے ہوتا ہے تمہارے
وہ کوچہ ہمیں شہرِ غزالاں سا لگے ہے

کیا جانئے لے آئی کہاں گردشِ دوراں
سایہ بھی یہاں اپنا گریزاں سا لگے ہے

جو لمحہ سرورؔ اُس کے تصور میں گزر جائے
وہ لمحہ بھی اب درد کا درماں سا لگے ہے

حمیدہ معین رضوی

محبت میں خسارہ چاہتے ہیں
نہیں اس پہ اجارہ چاہتے ہیں

جو روشن کر گیا تھا دل کا تخیر
وہی پھر سے شرارہ چاہتے ہیں

اندھیروں کے بھنور میں گم ہوئے ہیں
سفر کو اک ستارہ چاہتے ہیں

لہو کیوں بہہ رہا ہے بے کسوں کا؟
نہا اے رب نظارہ چاہتے ہیں

زمانہ چھین کر جو لے گیا تھا
وہ چہرہ ہم دوبارہ چاہتے ہیں

نہیں خواہش کبھی تھی سیم و زر کی
مگر اب تو گذارہ چاہتے ہیں

نہیں معنی رہے کچھ زندگی میں
بقا کا استعارہ چاہتے ہیں

پنہاںؔ

رسیلے خواب سارے کھو چکی ہوں
بہت روکھی حقیقت ہو چکی ہوں

جگائے کوئی سورج صبح نو کا
پرانی رات صدیوں سو چکی ہوں

غموں کو ہنس کے سہنا آ گیا ہے
میں اپنی ہر خوشی کو رو چکی ہوں

میں اپنے دل کی بنجر سرزمیں میں
خوشی کے بیج کتنے بو چکی ہوں

بہت میلی تھی چادر زندگی کی
اسے اشکوں سے اپنے دھو چکی ہوں

چلا ہے ساتھ تنہائی کا جنگل
ترے ہمراہ جب سے ہو چکی ہوں

امانت یہ بھی لوٹانی ہے اس کو
بدن کا بوجھ برسوں ڈھو چکی ہوں

رہا کہنے کو اب کیا اور پنہاںؔ
غزل سے حال سب کہہ تو چکی ہوں

سلطان صبروانیؔ

خواب سے تعبیر تک کا سلسلہ دیوار سے
جس نے خود دیکھا ہو وہ کیا پوچھتا دیوار سے

پہلے راحت کے لئے تعمیر اِک دیوار کی
مانگنا اب پڑ گیا ہے راستہ دیوار سے

کوئی روزن ہی نہیں رکھا بڑی عجلت میں تھے
کیسے آتی روشنی یا پھر صدا دیوار سے

سُن رہا ہوں شہر میں پھیلی ہوئی سرگوشیاں
کیا کہا دیوار نے اور کیا سُنا دیوار سے

موند لی آنکھیں تو کیا آنسو تو رُکتے ہی نہیں
سیل گریہ کا بھلا کیا واسطہ دیوار سے

ہے اسی دیوار سے کچھ آسرا آرام کا
سائے کو کیسے کرو گے تم جُدا دیوار سے

میں نے سب کچھ پڑھ لیا ہے جو بھی کچھ ہونے کو ہے
اب بھلا کیا رہ گیا ہے پوچھتا دیوار سے

شاید اس طرح سے ہی وہ دل کی حالت جان لیں
کہہ نہ پائے جو کبھی اُن سے، کہا دیوار سے

بیٹھ نہ جائے کسی لمحے یہی دھڑکا رہا
گرچہ ہم کو مل رہا ہے آسرا دیوار سے

یہ مجھے محفوظ رکھتی ہے مگر محصور بھی
صبر کیسا رابطہ ہے اِک خوف کا دیوار سے

قیصر نجفی

بات بے بات اگر ٹھن جائے
بات مشکل ہے کہ پھر بن جائے

کوئی بتلاؤ کہ کیا کرتے ہیں
خود سے انسان کی جب ٹھن جائے

اور کچھ دل میں اتر جاتا ہے
کوئی روٹھا ہوا جب من جائے

دوستی دھاگا ہے اک نازک سا
ٹوٹ جاتا ہے اگر تن جائے

کوئی تارا سرِ مژگاں ہے ضرور
روشنی سی جو کبھی چھن جائے

دانت اژدر کے بھی گنتا ہے کوئی
جاں پہ قیصؔر نہ تری بن جائے

کرشن کمار طُور

بڑی چمک پہ ہو ایسا لہو ضروری ہے
بیان دل میں نہ میں اور نہ تو ضروری ہے

دل اوبتا ہے جو آسائشیں میسر ہوں
مری وفا کے لئے اک عدو ضروری ہے

وصال و ہجر تو قسمت کی بات ہے لیکن
تو سامنے ہو تو پھر گفتگو ضروری ہے

کسی بھی طرز کو ورنہ یہاں ثبات نہیں
مرے جنوں کو زمانے کی خو ضروری ہے

لپک رہا ہے اک آتش نفس سے سارا بدن
جو مجھ میں جذب ہو وہ آب جو ضروری ہے

ہے کوئی جو کہ ہو تیار سر کٹانے پر
زمیں زرد پہ اک سرخ رو ضروری ہے

کسی کی رونق وصلت کے واسطے اے طُور
کچھ اور ہو کہ نہ ہو ایک تو ضروری ہے

غالب عرفان

سوار اُس پہ نیا امتحان کب سے ہے؟
لہو لہو یہ انا کی چٹان کب سے ہے؟

زمین علم پہ اہرام مصر کے اندر
شکستگی کی کھلی داستان کب سے ہے

ہوا کی سمت پہ بہتے ہوئے سفینے پر
مخالفت میں کھڑا بادبان کب سے ہے

تمام جنگوں کی بنیاد نفرتیں ہیں تو پھر
محبتوں کا سفر درمیان کب سے ہے

وہ ضرب کاری تھی تو پر چھائیں کو یہ فکر ہے کیوں
جبیں پہ زخم کا گہرا نشان کب سے ہے

نہ صبح و شام کی سرخی نہ نیلگوں چادر
ہمارے سر پہ یہ آسمان کب سے ہے

یقیں کی روح کا عرفانؔ رکھنے والوں کو
خود اپنی ذات کے اندر گمان کب سے ہے

ملک زادہ جاوید

رات کو دیر تک وہ جاگے ہیں
آنکھ کے گرد کالے دھبے ہیں

اُس سے اب تک خط و کتابت ہے
کتنے مضبوط دل کے رشتے ہیں

بارشوں سے کہو کہ تھم جائیں
اِس محلّے کے گھر پُرانے ہیں

خوشبوؤں کے بغیر گلوں میں
آجکل پھول روز کھلتے ہیں

جانے کس سمت ہم چلے جائیں
مدتوں بعد گھر سے نکلے ہیں

شرم آتی ہے اُن بزرگوں پر
جو کہ بچوں پہ طنز کرتے ہیں

اپنے لہجے کو نرم رکھ جاویدؔ
انکساری کے کچھ تقاضے ہیں

خیال آفاقی

اک آزمائش بالتفات عشق سے ہے
ہزار رنج و الم سے نجات عشق سے ہے

بدن کے شیش محل میں ہے عشق روح رواں
مثال شمع فروزاں حیات عشق سے ہے

بفیض عشق مقدر ہے دن کا ہنگامہ
یہ چاندنی یہ ستاروں کی رات عشق سے ہے

نگاہ و دل سے ہے دنیائے رنگ و بو کو قرار
ہر ایک نقش فنا کو ثبات عشق سے ہے

وہ کار خلقت آدمؑ وہ سجدہ و تعظیم
وہ رمز عشق تھا' یہ کائنات عشق سے ہے

مرے سخن کی لطافت ہے اہل دل کے لئے
کہ اہل زر سے نہیں میری بات عشق سے ہے

خیالؔ نام و نسب ہے فقط غرور و فریب
صفات عشق کی حاصل ہیں ذات عشق سے ہے

محمد ظہیر

درختوں میں ہوا رونے لگی ہے
خزاں کی ابتدا ہونے لگی ہے

ہوئی ہے رات محرومی ازل کی
کسی فٹ پاتھ پر سونے لگی ہے

ہر اک شے کھو رہی ہے اصل اپنی
نہ ہونے کی طرح ہونے لگی ہے

ضرورت تھی اسے شیریں ثمر کی
یہ دنیا زہر کیوں بونے لگی ہے

مصیبت بن گئے ہیں رنگ ان کے
پروں کو تیتری دھونے لگی ہے

جو کچھ صدیوں میں دنیا پا گئی تھی
دنوں میں اب اسے کھونے لگی ہے

ظہیرؔ اس خاک میں نیکی رچی تھی
یہ کیوں بار گنہ ڈھونے لگی ہے

دِل نواز دِلؔ

دُنیا میں دِل کے ساز کا سامان نہیں ہے آج
کوئی کسی کے درد کا درمان نہیں ہے آج

ہر شام دیکھئے شامِ غریباں نہیں ہے آج
ہر صبح دیکھ صبحِ اُمیراں نہیں ہے آج!

صورت ہے کوئی جو کہ پریشان نہیں ہے آج
آئینہ ہے جو عکس سے حیران نہیں ہے آج!

اُڑتی تھی ریت جس میں کبھی ہر طرف ہمیش
وہ دَشت ہے جو دہر میں ویران نہیں ہے آج

صد شُکر کر رہا ہے اَدا میزبان دیکھ
اس واسطے کہ گھر میں وہ مہمان نہیں ہے آج

چُن چُن کے باغباں نے اِکٹھے کئے ہیں پھول
گُلشن میں کوئی چاک گریباں نہیں ہے آج

موجوں میں لہر لہر نہ لہروں میں موج فوج
ساحل پہ کوئی جوششِ طوفاں نہیں ہے آج

آتی تھی اور صبح کو جاتی تھی چاند رات
کیا چاند رات دِن سے گریزاں نہیں ہے آج!

پوچھے ہے دِلؔ سے دیکھ ہر اک آنکھ تیرہ بخت
کیا ہر کوئی جہان میں عُریاں نہیں ہے آج

ڈاکٹر حنیف ترین

سیلِ جنوں میں عشق نے ممکن بنا دیا
تیشے نے سطحِ دل پہ پہاڑوں کو ڈھا دیا

تتلی بھی میرے سنگ مزے لے کے کھل اُٹھی
جب میں نے روتے بچے کو کھل کر ہنسا دیا

سونے وہ لکھ چکے ہیں یہ تاریخِ زرنگار
ہوں گے یہ مشتعل اگر اِن کو جگا دیا

مر کر بھی وہ رہے گا ہمیشہ عظیم تر
انسانیت کے رُوپ کو جس نے جلا دیا

جس مصلحت میں میرے تحفظ کا راز تھا
آج اُس نے وائے میرا تماشہ بنا دیا

حسنِ عمل جو لے کے جئے' اُن کو بھی حنیفؔ
خاکسترِ حیات نے کندن بنا دیا

سید خورشید انور رضوی

پلٹ کر اتنا پیچھے دیکھتا ہوں
میں بچپن کے کھلونے ڈھونڈتا ہوں

یہ کیسے خواب ہر شب دیکھتا ہوں
کوئی تو ہے جسے یوں ڈھونڈتا ہوں

لگے کچھ یوں خلا میں تیرتا ہوں
لگے ہے نیند میں ہی چل رہا ہوں

میں خود کو ڈھونڈنے نکلا تھا اب تو
خیالوں میں کسی کے کھو گیا ہوں

عزیزو! اور کیا تم چاہتے ہو
محبت سی تمہیں شے دے رہا ہوں

رب نواز مائل

یہ کیسا ہے سلوک اُن کا وطن سے
کہ نافر ہیں تو اِس کے حُسن و فن سے

نہ اِک معنی میں بھی جب اُس کو ہوں کچھ
یہ جانچا ہے مجھے کیا اُس نے من سے

جو سب ہی تولنے بیٹھے ہیں مجھ کو
کہا کیا ہے وہ یُوں اور کس لگن سے

بہر تمثالِ خود جیسی بھی ہوں وہ
کمالِ تن کی باتیں تو ہوں تن سے

اِسی میں جیسے خیرِ خود کا بھی سب
جو بول اپنے، سبھی ہوں انجمن سے

پروفیسر غفار بابرؔ

جب اپنی ''رہائی'' بھی ہے ''تخدِ غن'' سے زیادہ
پھر کیوں نہ ''قفس'' ہو گا ''نشیمن'' سے زیادہ

گو ''زیست'' یہاں کم نہیں ''مدفن'' سے زیادہ
''چُپ'' بھی ہے مگر ''نالہ وشیون'' سے زیادہ

یہ دِل ہے میری جان ذرا سوچ سمجھ کر
نازک ہے بہت کانچ کے برتن سے زیادہ

فطرت نے سجایا تجھے ''پیراہنِ گُل'' میں
خوشبو بھی کہاں ہے تری ''اُترن'' سے زیادہ

آتا ہو اگر مانگتے رہنے کا قرینہ
دیتا ہے وہ پھیلے ہوئے دامن سے زیادہ

''مشاطۂ فطرت'' کی نوازش کہ رُخِ یار
کچھ اور نکھر آیا ہے ''جوبن'' سے زیادہ

یہ عشق کی وادی ہے قدم سوچ کے رکھنا
چُبھتے ہیں یہاں ''پھول'' بھی ''سوزن'' سے زیادہ

جس دل کے لئے اتنا یہ ہنگامہ ہے برپا
کچھ بھی تو نہیں ایک ہی ''دھڑکن'' سے زیادہ

''دُنیا'' کہ جسے کہتے ہو ''عشرت'' کا ٹھکانہ
ہرگز نہیں اِک رات کی دُلہن سے زیادہ

معلوم نہیں کس لئے جلتے ہیں میرے یار
مجھ سے بھی کہیں بڑھ کے میرے فن سے زیادہ

اِس عُمر میں بھی چاند کو پانے کی تمنا
بابرؔ یہ طلب ہے تری بچپن سے زیادہ

پروفیسر زُہیر کنجاہی

چاروں طرف جہاں میں پھر کرب اِبتلا ہے
مظلوم سَرنگوں ہے زردار رہنما ہے

پیشِ نظر ہے سب کے اپنی ہی ذات یارو
دورِ مُنافقت میں ہر شخص خودنما ہے

قلب ونظر میں نفرت چہروں پہ ہے مُسرّت
ہر سمت پُرتملّق ہر شخص میں ریا ہے

یہ سادگی ہے دل کی یا وقت کا کرشمہ
مظلوم ظالموں سے انصاف مانگتا ہے

ہر دِل میں حسرتوں کا کتبہ لگا ہُوا ہے
گویا قدم قدم پہ آسیب بسا ہے

انسانیت سے عاری اَب ہو رہی ہے دُنیا
میں نے زُہیر دیکھا کانوں سے بھی سُنا ہے

اجیت سنگھ حسرت (لدھیانہ، بھارت)

ہستی کے گُلستاں میں وہی شخص ولی ہے
غُنچوں کے چٹکنے کی صدا جس نے سُنی ہے

ہے شامِ شفق جیسا دھواں گنگا کنارے
اِس جا کسی جوگن کی چِتا جل کے بجھی ہے

جب زور چلا ہم کو اُڑا لے گئی آندھی
سُوکھے ہُوئے پتّوں سی یہاں دربدری ہے

ہنستے تھے جہاں پھُول وہاں روتی ہے شبنم
ہر دِن کے مُقدر میں سیہ رات لکھی ہے

اَے زیست تُجھے مَیں بھی اگر بھُول چُکا ہُوں
تُو بھی تو مجھے رکھ کے کہیں بھُول گئی ہے

گھِر گھِر کے کئی بار گھٹا کا وہ برسنا
تپتے ہوئے صحرا کی کہاں پیاس بجھی ہے

پانی کئی ندیوں کا پیا پھر بھی ہوں پیاسا
ساگر ہُوں مگر پھر بھی وہی تشنہ لبی ہے

سچ بات سے ڈرنے لگے سُقراطِ جہاں بھی
شیشوں نے بھی چہروں پہ عجب گرد ملی ہے

معصوم ہے بچّوں سی یہ مریم سی مقدس
حسرت یہ غزل تُم نے فرشتوں سی کہی ہے

صدیق شاہد

دل جراحت آشنا ہیں، روحیں کلفت آشنا
اس پہ بھی زندہ دلوں کو زندگی کا حوصلہ

ہے خطر ہو کر نتائج سے لئے پھرتا رہا
کیسی کیسی چوٹیوں پر دل کا پنچھی من چلا

میں بھی ان جانے سے کن جذبوں کی رو میں گُم ہوا
مدتوں میں خود سے ملنے کو ترستا ہی رہا

واہمہ تھا یا ہم آغوشی کی دُھن تھی، دوستو
میں نے دیکھا، چاند میرے بازوؤں میں آ گیا

خستگی ایسی تو کچھ ظاہر نہ دیواروں کی تھی،
دفعتاً سارے کا سارا گھر زمیں پر آ گرا!

دستکیں دیتی تھی شاہدؔ تہ بہ تہ رنگوں کی موج
میں حصارِ ذات میں گم تھا میں کیسے دیکھتا

حصیر نوری

ہم عیاں رنج کے اثرات نہیں کرتے ہیں
اس لئے لوگوں سے ہم بات نہیں کرتے ہیں

بھیڑ میں ملتے ہیں کترا کے گزر جاتے ہیں
شہر میں لوگ ملاقات نہیں کرتے ہیں

مضطرب بیٹھے ہیں سب شہر کے ہنگاموں میں
خوف اتنا ہے کہ سوالات نہیں کرتے ہیں

پیش و پس میں مرے رہتے ہیں کئی ہمسائے
یہ الگ بات کہ کوئی بات نہیں کرتے ہیں

آگ جنگل میں بلاوجہ بھی لگ سکتی ہے
لوگ اندازۂ آفات نہیں کرتے ہیں

خشک مٹی کا مقدر نہیں پھرنے پاتا
ابر آئے تو ہیں برسات نہیں کرتے ہیں

ہم کہ مجبور ہیں ہجرت کے تقاضے سے حصیر
دن جہاں گزرے وہاں رات نہیں کرتے ہیں

شگفتہ نازلی

راہِ وفا طے کرنا' بہت ضروری ہے
اور رستے میں ٹھہرنا' بہت ضروری ہے

ایک سی چیز کو دیکھ کے اُکتا جائیں تب
آگے پیچھے کرنا' بہت ضروری ہے

کڑوی کسیلی باتوں کی اِس رم جھم میں
بول اِک میٹھا سننا' بہت ضروری ہے

دائیں بائیں جب کوئی من کو بھائے نہیں
اپنے مَن میں رہنا' بہت ضروری ہے

آنکھ کے آنسو کو بہلانے کے لئے
تھوڑا سا تو ہنسنا' بہت ضروری ہے

کتنا بھی دُنیا کو دیکھو اور گھومو
اپنے گھر میں بسنا' بہت ضروری ہے

کچھ رشتے ہیں جن سے دُنیا داری کو
کبھی کبھی تو ملنا' بہت ضروری ہے

باہمی ربط و ضبط بحال تو رکھنا ہے
دیکھیے کچھ تو کہنا' بہت ضروری ہے!

فیصل عظیم

کیا ڈریں خوابوں سے یا خوابوں کی تعبیروں سے ہم
کھیلتے پھرتے ہیں خود اپنی ہی تقدیروں سے ہم

فلسفوں کی ابتدا اور انتہا جب ایک ہے
کیوں نہ رنگِ آگہی چھلکائیں تحریروں سے ہم

مدتوں سے پاؤں میں ہیں بیڑیاں سی بے شمار
کیا رکیں گے آپ کی دو چار زنجیروں سے ہم

کیوں ہمیں اس بت کدے میں لا کے حیراں کر دیا
پھیر لیں کیسے نظر رنگین تصویروں سے ہم

ہم کو اس جلووں کے زنداں سے رہائی تو ملے
چھوٹ ہی جائیں گے ان خوشبو کی تعزیروں سے ہم

وصل کی باتوں پہ اک رانجھے کا آتا ہے خیال
عذر آخر کیا کریں اس شہر کی ہیروں سے ہم

اوصاف شیخ

مدتوں سے ہوں جس کے دھیان میں گُم
وہ نہ جانے ہے کس جہان میں گُم

آ گئی ہے زمین سکتے میں
اور زمیں زاد آسمان میں گُم

جانے کب راستہ میرے گھر کا
ہو گیا ہے تیرے مکان میں گُم

ڈھونڈتے ڈھونڈتے نشان ترا
دیکھ خود ہو گیا نشان میں گُم

بن رہا ہے کوئی کہانی نئی
کر کے پھر مجھ کو داستان میں گُم

کس جزیرے کی تم پناہ میں ہو
یا سمندر کے درمیان میں گُم

ایک سایا تھا ہم رکاب مرا
ہو گیا وہ بھی سائبان میں گُم

میں کہ اپنی انا پہ نازاں تھا
ہو گیا تیری آن بان میں گُم

آدمی آسماں کو بھول گیا
ہو کے اوصاف خاکدان میں گُم

سیّد امتیاز احمد

کسی کو راس آتیں الفتیں کیا؟
سو ہم کیا اور ہماری خواہش کیا

نہیں تھے کیا کسی گنتی میں بھی ہم
ہیں اب بھی ویسی ہی وہ محفلیں کیا

ہوئے جاتے ہیں بوسیدہ ترے غم
نیا کوئی سہارا ڈھونڈ لیں کیا

نہ راہیں طے نہ منزل ہی معیّن
یونہی بے سمت ہم بھی چل پڑیں کیا

ہم اس محفل میں ہیں بھی اور نہیں بھی
چلے جائیں تو کیا؟ بیٹھے رہیں، کیا؟

تمہیں ہم کیا سنائیں شعر اپنے
تمہاری باتیں ہیں تم سے کہیں کیا؟

نوید سروش

بھروسا کیا اُن کی وفاداریوں کا
رہے خوف جن کو گرفتاریوں کا

بھلا کس پہ کوئی بھروسا کرے اب
کہ یہ دور ہے صرف مکاریوں کا

بھروسا ہے مجھ کو مرے رہ نما پر
نہیں خوف رستے کی دشواریوں کا

گلوں سے بھری تم نے مسمار کر دیں
قصور اس میں کیا بھلا کیاریوں کا

الٰہی چمن پھر سے سرسبز کر دے
وطن میں محبت کی پھلواریوں کا

شہاب صفدر

میں لاکھ پھڑ پھڑایا پر نکلا نہ جال سے
قیدِ قفس میں ہوں پر وبائی کے سال سے

دنیا تو خیر کس کی ہے غمخوار و چارہ ساز
حالاں ہے دین بھی خلشِ دل کے حال سے

اے برق جلوہ گر ہو کہ فطرت بھی جان لے
بے برگ و بر تہی نہیں ذوقِ جمال سے

یہ روز و شب تمہارے لیے ہیں وگرنہ مہر
بے غم ہے شرق و غرب و عروج و زوال سے

تقدیر و انتظار کے چکر میں ہے شہابؔ
دُور آسمانِ ہجر، زمینِ وصال سے

زندہ باد

شمشاد احمد

اللہ جانے "زندہ باد" کو خود بھی اپنا اصل نام یاد تھا یا نہیں! بچے بوڑھے بھی اُسے زندہ باد ہی کہتے سنتے آئے تھے۔ اس سلسلے میں پرانے بچے کھچے بوڑھوں سے استفسار کیا جاتا تو وہ اپنے پوپلے منہ میں ہنسی کی گُھگی کرتے ہوئے مزے لے کر تفصیل بتاتے۔

"شروع دن سے ہی دیوانہ تھا..... اِدھر اُدھر کہیں کسی جلسے جلوس کی بھنک پڑتی تو بن بلائے دوڑ پڑتا..... مٹھیاں اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے..... اس کا باپ اپنی ٹوٹی ٹانگ پر پھدکتا سارا دن اُس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا۔

پھر جیسے بوڑھوں کی اُجڑی آنکھوں میں دھنک جاگ اُٹھتی۔

"زندہ باد جب اپنی آتش فشانی آواز میں نعرہ لگاتا تھا تو مجھے لگتا کہ رگوں میں خون کی جگہ چنگاریاں دوڑنے لگتی تھیں..... نعرۂ تکبیر..... نعرۂ رسالت..... قائداعظم....."

جاسو انگریز اپنی ڈگڈگی کی طرح پچکے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر روکتا اور بڑبڑاتا۔

"انگریز ذات بڑی کمینی ہے..... کبھی سونے کی چڑیا کو چھوڑ کر نہ جاتا..... وہ زندہ باد کے نعروں سے ڈر کر بھاگ نکلا تھا۔"

زندہ باد ذات کا ترکھان تھا۔ بھاٹی دروازے کے اندر ایک دو فٹی گلی میں ڈیڑھ مرلے کے مکان میں خوش باش رہتا تھا۔ وہیں اوپری منزل کے نیچے تلے اس کی دکان تھی۔ وہ مغرب کی اذان پر تام جھام لپیٹ کر اندر کر لیتا تھا۔ یہ گھر اور دکان اُسے ورثے میں ملے تھے۔

تھوڑا سنکی واقع ہوا تھا..... دنیا کو اپنے اصولوں سے چلانا چاہتا تھا۔

وہ کسی صورت بھی کسی کے گھر کام کرنے نہ جاتا تھا..... اگر کوئی گلی محلے کی دھول میں اٹی بچی بڑی اٹھائے آجاتا تو ناک منہ چڑا کر تھوک پھینک دیتا اور اکثر غصے میں معاوضہ بھی نہ لیتا تھا۔

اُسے صرف اور صرف کھلونے بنانے سے دلچسپی تھی..... ملائم سنڈول لکڑی کے گڈے گڑیاں، دلہن کی پالکیاں اور رنگ برنگے لٹو اور پھمبیریاں..... جہاں جہاں ضرورت محسوس کرتا، ہاتھ کی خراد سے انہیں چمکدار کچے رنگوں سے زندہ کر دیتا..... وہ ان کھلونوں کو دیکھ دیکھ کر خود ہی خود خوش ہوتا رہتا تھا..... اس کو یہ تخلیقی عبادت بھی اوپر سے ملی تھی۔

وہ اپنے بنائے ہوئے کھلونے صرف اپنی دوکان پر بیچتا تھا..... صبح اُٹھ کر گڈے گڑیاں دیوار میں جگہ جگہ نصب کیلوں کے سہارے سجاتا..... پالکیاں اُن کے نیچے فرش پر کندھے سے کندھا جوڑے گاہکوں کی منتظر رہتیں..... لٹو اور پھمبیریوں کی ڈھیری الگ لگ جاتی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ زندہ باد کبھی ہمارے پاکستان کی طرح قد آور اور مضبوط تھا..... وقت، حالات اور اس کے بیٹوں کے رویے نے اُسے چبا چبا کر ایک کبڑے مسخرے میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

ایک بیٹے نے ایک نئی دولتی مارکیٹ میں اپنا شوروم کھول لیا تھا اور دوسرے درجے کے فرنیچر کو اول درجے کا نام بنا کر خوب دولت کما رہا تھا..... دوسرا ٹھیکیدار بن کر سرکاری ملازمین کے تعاون سے اپنی سرکار کو لوٹ رہا تھا۔ دونوں نے زندہ باد اور اس کے گھر کو چھوڑ کر مہنگی بستیوں میں اپنے اپنے مکان تعمیر کر لئے تھے۔

اُن کے بار بار کے اصرار کے باوجود زندہ باد اپنے آبائی اجداد کا گھر اور دوکان چھوڑنے پر تیار نہ ہوا۔

باپ سے مایوس ہو کر انہوں نے ماں کے ذریعے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔

زندہ باد بپھر گیا۔

"تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ..... میں یہیں مروں گا۔"

بڑھیا اس کی سبکی پر رو دی۔

زندہ باد نے اس کی برستی آنکھوں میں جھانکا..... وہ ان آنکھوں کو ایک نظر میں پڑھ لیتا تھا..... ان آنکھوں نے زندگی بھر صرف اور صرف اس کا ساتھ دیا تھا..... بس ایک وہ ہی تھی جو ذرہ برابر بھی نہ بدلی تھی۔

بیٹے مایوس ہو گئے لیکن اکثر اِدھر اُدھر ملنے والوں سے شکایت کرتے رہتے تھے۔

"اللہ نے اتنا کچھ دیا ہے..... بوڑھے کو ہماری عزت کا خیال نہیں۔"

زندہ باد کی عزت کا معیار ان سے مختلف تھا۔

دنیاداری رکھنے کو وہ مہینے دو مہینے میں پھیرا ڈال جاتے تھے۔
اس کی پوتی کی سالگرہ قریب تھی۔ وہ مصر تھی کہ دادا اپنے ہاتھ سے گڑیا اور پالکی بنا کر دے۔

زندہ باد نے دوکان پر ایک چھوکرا رکھ چھوڑا تھا...... چھوکرے آتے جاتے رہتے تھے...... دو چار مہینے کام سیکھا اور اپنے آپ کو استاد سمجھ کر چل دیے۔

چھوکرے نے دوکان کھول لی تھی اور حسبِ توفیق صفائی بھی کر دی تھی۔

زندہ باد کو تو اب کام چڑھا ہوا تھا۔ وہ دور ہی سے دوکان پر نہ اترا تھا۔ اس نے اپنی اسٹیل کی کمانیوں والی عینک لگائی تو دھند کے بادل چھٹ گئے...... دوکان روشن ہو گئی۔

سب سے پہلے اس کی نظر پر شیشے کے نازک شوکیس میں رکھے پنکھے پر گئیں...... اس کی آنکھیں تر ہونے لگیں۔

اس نے پگڑی کے پلو سے شوکیس صاف کیا۔ پھر بڑی احتیاط اور احترام سے پنکھے کو باہر نکالا...... اس پر مٹی جم گئی تھی...... وہ اسے ہلکے ہلکے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا...... اس کی تسلی نہ ہوئی...... اس نے پگڑی کے پلو کا ایک کنارا چٹکی پر لپیٹا اور پنکھے کی اونچ نیچ میں جمی گرد کو چھیل چھیل کر نکالنے لگا۔

پنکھا جاگ اٹھا...... اس کے رنگ چمکنے لگے۔

سفید شیروانی، سر پر قراقلی کی ٹوپی...... ایک آنکھ پر چشمہ......
چشمے کے کونے سے بندھی سیاہ ریشمی ڈوری پنکھے کی گردن تک چلی گئی تھی......
کھلی پیشانی عزم کی چٹان......

زندہ باد پنکھے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھا ہو...... حالانکہ یہ اس کی اپنی تخلیق تھی...... اس نے بے جان لکڑی میں اپنی ساری مہارت، بے لوث دیوانگی اور بے پناہ محبت پھونک کر اسے زندہ کر دیا تھا۔

اسے اس پنکھے کو خریدنے کے لیے کیا کیا آفریں آئی تھیں......!
اس کی آنکھیں پھر دھندلا گئیں۔

چھوکرا کسی کی پرانی چارپائی کی چولوں میں پچاس ٹھونک رہا تھا۔

زندہ باد قریب رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا...... ماضی نے اس کی انگلی پکڑی اور اسے دوڑاتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔

منٹو پارک میں ایک ہجوم تھا...... ہنستا روتا، جذبات کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا۔

قائد اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھا تھا۔
زندہ باد کے سامنے لاؤڈ اسپیکر کی مائک تھی۔
اس کے اندر آگ بھڑک رہی تھی...... اس نے اپنی روح سے نعرہ لگایا۔

"نعرۂ تکبیر...... نعرۂ رسالت...... قائد اعظم......"

ہجوم کے پھیپھڑے پھٹ گئے۔
لاکھوں انسانوں کے اندر ایک دل دھڑک رہا تھا۔ انھیں شاہی مسجد کے میناروں کے اوپر جھلمل جھلمل کرتا اپنا وطن صاف نظر آ رہا تھا۔

جلسہ ختم ہوا...... ہجوم دلوں میں امید اور یقین کی شمعیں جلائے رخصت ہونے لگا۔

زندہ باد ایک عجیب سے نئے نشے میں سرشار مجمعے کی ہل چل دیکھ رہا تھا۔

اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا...... مسلم لیگ کا ایک رضاکار ہری وردی میں ملبوس مسکرا رہا تھا۔

"جوان تم بے حد خوش نصیب ہو...... تمھیں قائد نے یاد فرمایا ہے...... آؤ میرے ساتھ......"

قائد کار کے کھلے دروازے پر اس کے منتظر کھڑے تھے۔
زندہ باد پر نظر پڑتے ہی ان کی سنجیدہ پیشانی پر پھول کھل اٹھے۔

انھوں نے اپنا بازو پھیلا کر اس کے کندھے پر تھپکی دی۔
"پاکستان بن کر رہے گا...... اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی...... تم پاکستان جاؤ گے، پاکستان تمھارا ہوگا۔"

زندہ باد کا کندھا مقدس ہو گیا...... اس کے بعد اس نے کسی کو اپنے دائیں کندھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیا۔

پھر پاکستان بن گیا...... خواب کو وجود مل گیا۔
زندہ باد نے پاکستان جا کر ہی دم لیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی مہاجروں کا سیلاب آ گیا...... لٹے پٹے، خون اور آہوں میں لت پت...... لیکن ان کی گردنیں تنی تھیں...... پیشانیوں پر عزم کا نور تھا...... آنکھوں میں امیدوں کے چراغ روشن تھے...... قلعے کتنے کام وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

زندہ باد نے ان کی خدمت میں دن رات ایک کر دیے۔

اِس دوران اُس نے قائد کا مجسمہ بنا لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے خلوص اور محبت کا شاہکار قائد کو خود پیش کرے۔

اُس نے ٹکٹ کٹایا اور کراچی پہنچ گیا۔ پھر پوچھتا پاچھتا گورنر ہاؤس جا پہنچا...... اُسے پتا تھا کہ اس کا قائد وہیں ملے گا۔

اُسے پہلا دھچکا لگا...... محافظوں نے اُسے باہر سڑک پر روک دیا...... وہ اڑ گیا، الجھ گیا...... وہ مارا پا۔ اُسے جیل میں بند کر دینے کی دھمکی دی گئی۔

اُس نے کندھے سے تھیلی نوچ ڈالی۔

"یہ دیکھو...... یہاں قائد نے ہاتھ رکھا تھا...... پاکستان میں نے چلایا ہے، پاکستان میرا ہے...... پاکستان زندہ باد"

محافظوں نے اُسے پاگل سمجھ کر گاڑی میں ڈالا اور شہر سے دور چھوڑ آئے۔

وہ مایوس نہیں ہوا۔ اُس نے واپس آ کر قائد کو خط لکھوایا۔ منٹو پارک والی ملاقات کا حوالہ دیا اور انتظار کرنے لگا۔

کوئی جواب نہ آیا۔

اُسے قائد پر شک نہ تھا۔ قائد پر شک کرنا گناہ تھا۔

اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ قائد کو کسی اندھیری کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا ہے۔

پھر خبریں آنے لگیں کہ قائد شدید بیمار ہیں...... انہیں زیارت بھیج دیا گیا۔

اُس سے رہا نہ گیا...... وہ زیارت جا پہنچا۔

سیکورٹی والے اُس سے عجیب و غریب سوالات کرنے لگے......

اس نے خدا رسول کے واسطے دیے...... ایک بار پھر اپنا سب سے اہم حوالہ...... اپنا کندھا دکھلایا۔

کوئی شنوائی نہ ہوئی...... سب اندھے بہرے ہو گئے تھے۔

زندہ باد رو دیا۔

اتنی جلدی لوگ تبدیل ہو گئے ہیں! اُسے یقین نہ آ رہا تھا۔

گھر آ کر اُس نے شیشے کا ایک شوکیس بنایا اور قائد کو اس کے اندر سجا دیا۔

پھر ایک دن اس کا قائد دنیا سے اُٹھ گیا، وہ روٹھ کر چلا گیا......

زندہ باد نے جگر شق اور خون منجمد کر دینے والی ایک لمبی چیخ ماری۔

"مار دیا...... ظالموں نے مار دیا۔"

زندہ باد کو موت کی چپ لگ گئی...... لیکن کبھی کبھار اُس کے پھیپھڑے پھٹ پڑتے اور وہ چیخنے لگتا۔

"پاکستان زندہ باد...... پاکستان زندہ باد......"

گلی محلے والے اُس کا نعرہ سن کر ایک دوسرے کو آنکھ مار کر مسکرا دیتے...... نئی نسل کے لئے اب وہ شخص ایک خبطی مسخرہ ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ گڈے گڑیاں، پالکیاں بناتا رہا...... بچوں کو بانٹنے میں لگ گیا۔

زندہ باد آس پاس کی دنیا سے کٹ کر آہستہ آہستہ لاپرواہ ہوتا گیا...... بیوی ڈانٹ ڈپٹ کر کپڑے بدلوا دیتی تو بدل لیتا ورنہ دنوں میلا کچیلا چلا رہتا...... اور کبھی کبھی بغیر کسی معقول وجہ کے بلک بلک کر رونے لگتا۔

زندہ باد زندگی بھر کبھی ڈھنگ سے بیمار نہ پڑا تھا...... موسم کی تبدیلی پر کبھی کبھار نزلہ زکام آ لگتا تھا۔ دو چار دن چھینک چھانک کر خود ہی دم دبا کر کھسک لیتا۔

جس دن مشرقی پاکستان بٹ کر بنگلہ دیش بنا زندہ باد چھناکے سے ٹوٹا اور بکھر گیا۔ اس کے چاروں طرف اس کی کرچیاں بکھری تھیں اور وہ انہیں دیکھ دیکھ کر سسکنے لگا۔

بیٹوں نے ہسپتال لے جانا چاہا تو وہ بگڑ گیا۔

"مجھے زندگی نہیں چاہئے...... مجھے اپنے قائد کے ساتھ ہی مر جانا چاہئے تھا۔"

ایک دن صبح صبح زندہ باد نے بیوی کو آواز دی۔

"آج میں غسل کروں گا، کپڑے بدلوں گا۔"

وہ بیوی کی مدد سے نہایا دھویا، سفید براق جوڑا پہنا اور بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے آنکھیں کھولیں...... اس کی بیوی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔

گھر خاموش، سرد اور تاریک تھا۔

اُس نے اپنی بہکتی زبان کو سنبھالتے ہوئے بیوی کو حکم دیا کہ وہ نیچے سے قائد کا پتلا لے آئے۔ زندہ باد نے مشتاق آنکھوں سے اپنے قائد کا دیدار کیا، اُسے چوما، آنکھوں سے لگایا...... پھر واپس بیوی کی طرف بڑھا دیا۔

"میرے قائد کو بھی میرے ساتھ دفن کر دینا۔"

پھر زندہ باد نے ایک ہلکی سی ہچکی لی اور مردہ باد ہو گیا۔

☆

مانگے کی ممتا

ڈاکٹر عمران مشتاق

ڈاکٹر کی بات سُن کر وہ سن ہو کر رہ گئی۔ کافی دیر تک تو اس کا ذہن سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر اُسے رپورٹس دکھا اور سمجھا رہی تھی مگر کوئی بات ڈھنگ سے سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ اس جھٹکے سے سنبھلنے کے لئے اُسے کافی وقت لگا ڈاکٹر اس دوران جا چکی تھی اور وہ اپنی سوچوں کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی۔ اس کو اب بھی یقین کرنے میں تامل تھا کہ جو کچھ اس کے کانوں نے سنا وہ ممکن ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اُسے اس بات پہ خوشیاں منانا چاہئے یا ماتم کرنا چاہئے۔

زوتھ کی زندگی میں راج کا آنا ایک ایسے خوشبو کے جھونکے کی مانند تھا جو آگے بڑھنے کی بجائے بدن سے لپٹ کر خود ہی مٹ جاتا ہے۔ وہ دونوں اتنے جلد قریب آئے کہ یہ بات سبھی کے لئے حیرت کا باعث تھی۔ دو ماہ سے بھی کم عرصے میں ہی نہ صرف انہوں نے ایک دوسرے کو کھوجا بلکہ جان بھی لیا نتیجتاً دونوں رجسٹرار آفس میں کھڑے نظر آئے اور وہ اکیلے نہ تھے دونوں کے والدین بھی ساتھ تھے۔ زوتھ کارنوال (Carnwall) کا مہکتا ہوا پھول تھی جسے اپنے رنگوں کی پہچان لندن میں آ کر ہوئی تھی وہ پچھلے دس سالوں سے لندن میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھی اور اسی فرم میں ملازم تھی جہاں راج صرف دو ماہ پہلے ٹرینی منیجر کے طور پر آیا تھا۔ راج گیارہ سال کی عمر میں ساؤتھ انڈیا سے اپنے والدین کے ساتھ آیا تھا اور پچھلے پندرہ سال کی انتھک محنت سے زندگی میں اپنا مقام بنا رہا تھا۔ سخت محنت اس کی گھٹی میں پڑی تھی اس کے ممّا اور ڈیڈی اب بھی اپنے گروسری اسٹور میں صبح سات سے رات دس بجے تک کام کرنے کے عادی تھے۔ زوتھ اور راج کو یک جان دو قالب ہونے کے لئے شاید چند لمحے ہی چاہئے تھے۔ وقت نے وہ لمحے انہیں مہیا کر دیئے۔ راج کا زوتھ کو اتنی جلدی پروپوز کرنا زوتھ کے لئے حیرت کا سبب نہ تھا بلکہ وہ تو جیسے اس انتظار میں ہی بیٹھی تھی وہ خوشی سے اس کی گردن میں جھول گئی۔ دونوں کے والدین نے خلاف توقع زیادہ مخالفت ظاہر نہ کی۔ راج کی مما شروع میں ناخوش ہوئیں مگر اس کے ڈیڈی کے سمجھانے کے بعد یہ بات گھر سے باہر نہ نکلی۔ راج اور زوتھ نے اپنا گھر الگ بنایا۔ جلد ہی لوگ ان کی ازدواجی زندگی کی مثالیں دینے لگے۔ دو سال پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے انہیں وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ گھر میں پہلا بحران تب گرا جب راج کی مما نے زوتھ سے پوچھا کہ ان کا فیملی شروع کرنے کا کب ارادہ ہے؟ زوتھ ایک مغربی لڑکی ہوتے ہوئے بھی شرما گئی۔ زوتھ جانتی تھی کہ راج ایک بڑی فیملی چاہتا ہے جس سے اُسے خود کوئی خاص اختلاف نہ تھا۔ اب تک انہوں نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا ہی نہ تھا وہ نہ جانتے تھے کہ یہ بظاہر معمولی سی بات ایک بڑا مسئلہ بننے والی ہے۔

اگلے دو برسوں میں یہ بات سامنے آئی کہ راج میں باپ بننے کی مکمل صلاحیت موجود ہے البتہ زوتھ اس معاملے میں قدرت سے مار کھا گئی تھی۔ اس میں کوئی ایسی کمی تھی جو اُسے ماں بننے سے روکے ہوئے تھی۔ اس کا علاج چل رہا تھا اور ڈاکٹر پرامید تھی کہ وہ کسی وقت انہیں خوشخبری سنا سکتی ہے۔ زوتھ کے لئے یہ عمل بوجھل کر دینے والا تھا وہ تھک کر رہ گئی۔ ماں بننا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی یہ بات تو اُسے اب ہی سمجھ میں آئی تھی۔

”راج کیا خیال ہے اگر ہم کوئی بچہ گود لے لیں؟“ زوتھ نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ اس دن وہ دونوں شام کو چائے پیتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

”بچہ گود لے لیں۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ یعنی کہ....“ راج جیسے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

”دیکھو ہماری شادی کو چار سال ہونے کو آئے ہیں اور اب تو اُمید کم ہوتی چلی جا رہی ہے“ اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں اور لہجہ اداسی لئے ہوئے تھا۔

”دیکھو زوتھ تم نے کبھی میرے پیار میں کمی محسوس کی“ راج اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولا۔

”نہیں راج میں نے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں کیا۔ مگر میں کیا کروں۔ میرا دل اِک ننھے سے بچے کے لئے مچلتا ہے“ وہ سسک پڑی اور آنسوؤں پہ بندھا بند آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ راج اُسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا اُسے کافی دیر لگی۔

زوتھ اُٹھتے بیٹھتے راج کو مجبور کرنے لگی کہ وہ ایک بچہ گود لے لے۔ راج بار بار انکار کرتا رہا۔ ایک دن وہ اپنے آپ پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور غصے سے پھٹ پڑا۔ اس دن دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی۔

”آخر تمہیں بچہ گود لینے میں قباحت کیا ہے؟“ زوتھ نے غصے سے چیختے ہوئے پوچھا۔

”میں ایسے کسی بھی بچے کو باپ کا پیار نہیں دے سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ اس لئے تم یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دو“ راج بھی خاصا طیش میں تھا۔

”چلو ایسا کر لو کہ بچہ تم انڈین فیملی کا لے لینا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“ زوتھ قدرے نرمی سے بولی۔

”زوتھ تم ایسا بھی سوچ سکتی ہو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات کبھی نہ آ سکتی تھی۔ تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں“ راج صدمے سے شل ہو کر رہ گیا۔

زوبھی کو فوراً احساس ہو گیا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس نے اپنا رویہ فوراً بدل لیا اور لگی راج کو منانے مگر راج کو تو جیسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ پھر کئی دنوں تک اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی مگر کب تک۔ ایک دن زوبھی نے یہ ذکر پھر چھیڑ دیا۔ جلد ہی وہ جان گئی کہ راج گو غصے کا اظہار نہیں کر رہا مگر وہ اس ذکر سے بیزار ہے۔ تھوڑی دیر بعد راج اٹھ کے چلا گیا۔ زوبھی جانتی تھی کہ شاید آج رات راج گھر واپس نہ آئے۔ ایسا دو تین بار پہلے بھی ہو چکا تھا کہ راج نے رات گھر سے باہر گزاری تھی اور ایسا دونوں کی لڑائی کے بعد وہ اپنے والدین کے گھر چلا جاتا تھا۔ آج بھی شاید ایسا ہی ہو۔

"میں کیوں اپنا آپ اندر ہی اندر جلا رہی ہوں۔ مجھے بھی اپنی زندگی خوشگوار گزارنے کا حق حاصل ہے۔" زوبھی گاڑی چلاتے ہوئے آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی۔ "آج کی شام میں بھی پب (pub) میں گزاروں گی۔" شادی کے بعد زوبھی شاذ و نادر ہی اکیلے پب کا رخ کرتی تھی۔ ہمیشہ راج اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ آج کی رات اس کے اندر بڑی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ اس کے جذبات عجیب سے ہو رہے تھے اور اسے اپنے اوپر قابو نہ تھا۔ آج کی رات غیر معمولی تھی۔

راج شام کو گھر واپس آیا تو گھر کی تنہائی اسے یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ زوبھی گھر میں نہیں ہے۔ اس نے اپنے لئے کافی بنائی اور صوفے پہ تقریباً لیٹ سا گیا۔ پچھلے چند ہفتوں سے اس نے محسوس کیا تھا کہ زوبھی بے حد چپ چپ رہنے لگی ہے۔ اداسی ہر دم اس کی آنکھوں سے جھانکتی رہتی۔ دونوں میں بات چیت بھی بے حد کم ہوتی۔ کبھی کبھار راج کو لگتا جیسے وہ اسے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اس کی ہمت نہیں پڑتی۔ راج نے ایسے کسی موقعے پر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی کیونکہ اس کے خیال میں وہ پھر ایک بچہ adopt کرنے کی بات شروع کر دے گی اور اس ذکر سے اب ہمیشہ کے لئے بچنا چاہتا تھا۔ وقت نے اچانک ان کے بیچ دوریوں کی وسیع خلیج پیدا کر دی تھی۔ رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور زوبھی کا ابھی تک کچھ پتہ نہ تھا۔ اب راج کو پریشانی ہونے لگی۔ زوبھی عموماً فون کر کے اطلاع دے دیا کرتی تھی اگر اسے کبھی دیر سے آنا ہوتا مگر آج ایسے کوئی آثار نہ تھے۔ پہلے اس نے سوچا کہ زوبھی کو اس کے موبائل فون پر فون کرے پھر خود ہی ارادہ بدل دیا۔ اس کا غصہ اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنے بیڈ روم میں آ کے اس نے کپڑے تبدیل کئے اور سگریٹ سلگا کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ جلتے ہوئے سگریٹ نے اسے ایش ٹرے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ ایش ٹرے اٹھاتے ہوئے اسے اس کے نیچے دبے ہوئے ایک کاغذ نے متوجہ کر لیا۔

وہ زوبھی کا خط تھا۔ راج اس کی تحریر کو ٹکڑوں میں بھی فوراً پہچان سکتا تھا۔ زوبھی نے لکھا تھا کہ "راج آج تم سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں اس لئے میں خط کا سہارا لینے پہ مجبور ہو گئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہ باتیں میں کبھی بھی تمہارے سامنے بیٹھ کے نہیں کر سکتی تھی۔ راج میں نے زندگی میں سب سے بڑھ کر اگر کسی کو چاہا ہے تو وہ تم ہو صرف تم۔ میرا خیال تھا کہ زندگی تمہارے مضبوط بازوؤں کے سہارے تمہاری محبت کے سنگ گزر ہی جائے گی اور کوئی کمی محسوس نہ ہو گی۔ مگر میں غلطی پر تھی۔ ممتا کا آفاقی جذبہ ہی شاید عورت کی تکمیل کرتا ہے۔ میں بھی اسی جذبے سے مار کھا گئی اور میں بار بار اسی بات پہ تکرار کرنے لگی کہ ہمیں کوئی بچہ گود لے لینا چاہئے۔ اس طرح میں اپنی ممتا کی تسکین کر سکتی تھی۔ لے پالک کی ممتا ہی سہی مگر یہ میرے لئے اتنا ضروری ہوتا جا رہا تھا جیسے زندگی اور موت کا مسئلہ ہو مگر تم یہ نہیں سمجھ سکے شاید تم جان بھی نہیں سکتے تھے تم ماں تو نہ تھے۔

اب جو سچ میں تمہیں بتانے لگی ہوں وہ ہماری زندگی کی بنیادوں کو ہلا دے گا مگر مجھے سچ بولنا ہی ہے ورنہ تو ہمیں بیاہی ہو گا۔ میں تم سے جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔ کیسے بولوں۔ میرا تو رواں رواں تمہاری چاہت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے محبوب سے بھلا کوئی کیسے جھوٹ بولے تو میں بھی نہیں بول سکتی۔ یاد کرو تین ماہ پہلے کی وہ رات جب جھگڑے کے بعد تم گھر سے چلے گئے تھے اور میں جانتی تھی کہ تم رات واپس نہیں آؤ گے اور تم گواہ ہو کہ میں نے تمہاری الگ کسی رات کی سچائی جاننے کی کبھی خواہش یا جستجو نہیں کی۔ میں بات کر رہی ہوں اسی رات کی۔ میں ذہنی طور پہ الجھی شکستہ ہو رہی تھی کہ اس رات میں نے پب میں خوب پی اتنی پی کہ مجھے اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ ہاں وہ اجنبی ہی تھا جو کافی دیر تک میرا ساتھ دیتا رہا اتنی دیر تک کہ مجھے ڈھلتی ہوئی رات میں گھر تک چھوڑ گیا اور صبح چلا گیا مگر میری زندگی کو ایک عالم بے خبر کے حوالے کر گیا۔ اپنے جسم میں ہوتی ہوئی تبدیلیوں کو میں کچھ نہ پا رہی تھی مگر ڈاکٹری رپورٹس نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ بات تو بے انتہا خوشی کی تھی مگر اک انجانے غم نے جیسے میرے دل کو چھو لیا کہ تم اس بچے کے باپ نہیں ہو۔ میں چاہتی تو بڑے آرام سے یہ بات تم سے چھپا جاتی اور ہماری زندگی بغیر کسی حادثے کا شکار ہوئے آرام سے گزر جاتی پر میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔ راج جو پیار کرتے ہیں وہ چاہنے والوں کو دھوکا نہیں دیتے۔ میں سچائی کے اس زہر کو تمہارے کانوں میں انڈیلتے ہوئے اس بات کا احساس کر سکتی ہوں کہ تم کیسا محسوس کر رہے ہو گے۔ اس سچ نے تمہیں مار ڈالا ہو گا۔ تمہیں کچل دیا ہو گا۔ تمہارے دکھ پہ میری بھی آنکھ نم ہے۔ ہمارے راستے شاید جدا ہو چکے ہیں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں کہ تمہیں کیسا دکھ دے رہی ہوں اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا میرے لئے ماں بننے کا ہو سکتا ہے یہ آخری موقع ہو اور میں اس موقعے کو ضائع نہیں کر سکتی۔ لے پالک کی ممتا بھی پایا نہیں ملتی آخری بار میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ راج میں اب بھی تمہیں بے حد پیار کرتی ہوں اور اگر مجھے معاف کر سکو تو..... خیر ورنہ میں تو تمہاری راہ ہمیشہ ہی دیکھتی رہوں گی۔ ممتا کی بات الگ ہے مگر تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

صرف تمہاری زوبھی

راون کی لنکا

گلزار جاوید

جس تیز رفتاری سے وقت گزرتا جارہا ہے' اُسی شدت سے مطالبہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ہر گھڑی دل کو یہی خوف کھائے جاتا ہے کہ اب فن کی کشتی بچی اور شامت۔ اعمال' فرشتۂ اجل کی مانند ہماری روح قبض کرنے پہنچی۔ قصور فن کا بھی نہیں! کب تک وعدوں کے لولی پاپ کے سہارے وقت کو مٹھی میں بند کئے رکھیں۔ وعدے بھی ایسے جن کی ایفا کی اُتنی ہی اُمید کی جاسکتی ہے جس قدر نئے بوڑھے مجیب' کم عمر بیوی' بازار میں بیٹھی خوبرو طوائف' عالمی مالیاتی اداروں یا چچا سام کے وعدوں کے پورا ہونے کی اُمید میں گزرا تمام بھی نا شاد و نامراد رہا کرتی ہے۔ وعدوں کی اور بھی خوبصورت و خوشنما شکلیں ہیں جن کے دام ہر رنگ میں گرفتار ہو کر زندگی کو فنون' کوکین' بھنگ' چرس' گانجا' ہیروئن' شراب وغیرہ کے نشے سے تنہا دھواں سکون اور تنہا ڈاکٹری علاج کیا جاسکتا ہے۔ ہم اِس خیال کے حامی ہیں کہ انسانوں کی سادہ لوحی سے اُسی قدر فائدہ اُٹھانا چاہیئے جس قدر فن میں برداشت کا مادہ موجود ہو ورنہ تیلپ ہو تو زیادہ کی خواہش میں اکثر بنا بنایا کھیل بگڑ بھی جاتا ہے' کبھی کبھی کھیل کے قواعد کا ذکر کرنے والے میلے کی رونق کم کرنے کا باعث بھی بن جایا کرتے ہیں۔

لہٰذا میلے کے استعمال سے خدا معلوم آپ کی سماعت اور قرأت نے کیا اثرات قبول کئے ہمارے لئے البتہ! کئی طرح کی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں! اوّل میلے کی نوعیت ہمیشہ عارضی اور ہنگامی ہوا کرتی ہے دوئم میلے کے معنی اور مفہوم بھیڑ' ٹھٹھا' رونق اور شور شرابے سے عبارت ہوا کرتے ہیں جن پر مستقل قوانین اور ضابطے اُس طرح لاگو نہیں ہوتے جس طرح دیرپا' اٹل اور ابدی امور پر ہوا کرتے ہیں۔ میلے کی ایک اور خاص بات لوگوں کو ہنگامی طرز پر رجوع کرنا ہوتا ہے جس میں دانستہ یا نادانستہ پائیداری اور دور اندیشی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے خوشنمائی پر توجہ مرکوز رکھنا ہوتی ہے۔ میلے کی ایک اور خاص بات اُس کا عارضی ہونا ہے ضرورت اور خواہش کے باوجود بھی میلے کو زیادہ عرصے تک طول نہیں دیا جاسکتا! سو ہم نے بھی پے در پے مطالبوں کے جواب میں ایک عارضی اور ہنگامی طرز کی کہانی گھڑنے کا ارادہ باندھا ہے۔ کہانی میں خیال کو پلاٹ کو منظرنامے تجسّس' تحرّک اور جستجو کو جگہ ملے نہ ملے مستی اور ہیجان کو خوب ہوا دی جائے گی۔ ایسا ہوتا آیا ہے' ایسا ہو بھی رہا ہے' ایسا ہوتا بھی رہے گا اس خیال کے پیشِ نظر ہوتے ہی دل میں طرح طرح کے وسوسے گھر کرنے لگے ہیں! بڑھتی عمر کے باعث قوٰی کا مضمحل ہونا' حالات کا جبر یا قنوطیت پسندی کے زیر اثر طبیعت پر کسلمندی کا قبضہ جمالینا' تخلیقی جوہر کا ہیچ ہونا وغیرہ!

آپ ہی بتلایئے اس تخلیقی کساد بازاری میں کریں تو کیا کریں! جائیں تو کہاں جائیں! کہانی درختوں پہ اُگتی ہے نہ کھیت کھلیانوں میں خودرو نظر آتی ہے۔ ندی نالوں' جھرنوں' آبشاروں میں تیرتی دکھائی دیتی ہے' کہانی ملتی ہے جیتے جاگتے' چلتے پھرتے' ہنستے گاتے' روتے بسورتے' چیختے دھاڑتے' لڑتے جھگڑتے' تھکے ہارے اور کھاتے پیتے لوگوں کے درمیان! کو دنوں مہینوں اور برسوں پر محیط جدائی کر کے فن کے دُکھ سُکھ بھوگنے اور مطالعے و مشاہدے کو زندگی کا حاصل جاننے کے بعد کسی کی مراد جسے مل جائے وہ قسمت کا دھنی کہلاتا ہے۔ برسوں کی کہنہ سالی' کام چوری' شامت کرن اور مصلحت آمیزی نے اس طرح کی مشقت کے لائق چھوڑا ہوتا تو آج ہم ایک کہانی خاطر ایک کہانی کے لئے خود کو اس طرح بے دست و پا ہرگز محسوس نہ کرتے۔ تنگیِ فن کی کشتی کے خوف سے خون کے دباؤ کا شکار ہوتے!

ذہن کے پردے پر اچانک ایک بجلی کوندی تو پتہ لگتا ہے اوپر والے کو ہمارے اوپر ترس آگیا ہے تبھی اُس نے ایک نہیں بہت سی کہانیوں کو ہماری جانب ہانک دیا ہے۔ ایک کہانی تو اُس شخص سے منسوب ہے جس سے صبح کے وقت ہر شریف آدمی کی ملاقات ہوتی ہے' جو نیکی اور بھلائی کی راہ دکھلانے کا ذمہ اُٹھائے ہوئے ہے مگر حق سچ کے جانے جدا ہونے کے باعث اُس کی بات میں تاثیر نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں لہراتی حق ناحق کے فیصلے کی تلوار' اُس کی بابت ہر طرح کی رائے زنی سے روکنے کے لئے کافی ہے۔ دوسری ملاقات جس ہستی سے ہوتی ہے وہ آپ کی نسلِ نو کا معمار ہے وہاں بھی آپ کی ذہنی زرگی لب کشائی کی اجازت نہیں دیتی۔ تیسری ملاقات جس ہستی سے ہو سکتی ہے وہ آپ کی اور آپ کے متعلقین کی صحت کا ضامن ہے اُس کی بابت حاشیہ آرائی کر کے آپ کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ چوتھی ملاقات والا آپ کی خوراک سے منسلک ہے' اُس کی ناراضگی بھی خطرے کا الارم بجا سکتی ہے۔ پانچویں آپ کے روزگار سے جڑا ہوا ہے' چھٹے کا تعلق آپ کی اور آپ کے اہلِ خانہ کی سفلی سے ہے۔ ساتویں کی مٹھی میں روزمرہ کے کاموں کی کنجی ہے' آٹھویں کی دسترس میں اس قسم کی شہ رگ دبی ہوئی ہے تو نویں کے شکنجے میں اس قسم کا مفاد جکڑا ہوا ہے۔ غرض یہ کشتی کہیں بھی جا کر ختم کی جائے مصلحت اور مجبوری کی کوئی نہ کوئی زنجیر تے تیں یا ہمارے مفادات کو اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ کسی کی بابت لب کشائی کر کے خطرہ مول نہیں لیا جا

سکتا، مگر کیا کیا جائے؟ اس اُلجھن کا کوئی حل تو ضرور دریافت کرنا ہوگا!

چند ساعتوں کی کالی رات کے بعد روشنی و نور کا ایک اوتار ذہن کے اُفق پر نمودار ہونے لگا ہے۔ اُمید کی ایک اور کرن جگمگانے لگی ہے۔ اس کی ایک اور شمع روشن ہو رہی ہے! اس سے پہلے ہمارا ذہن اس طرف کیوں نہیں گیا؟ حالانکہ خیال کے دھاروں کو سب سے پہلے اسی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھنا چاہئے تھا! آج کے ترقی یافتہ دور میں کام کو مٹھی میں بند کرنے کا ایک اور طریقہ ایجاد ہو گیا ہے جو انوکھا نرالا ہونے کے ساتھ محیر العقول بھی ہے۔ اور یہی یعنی! ہمارا اشارا اُسی مخلوق کی جانب ہے جسے آج کی دنیا کمپیوٹر کے نام سے جانتی ہے جو انسانی ذہن کی فعالی میں اُس سے بھی آگے نکل گیا ہے! گذشتہ ایک دہائی میں اس نے انسانوں کی زندگی میں جس قدر انقلاب برپا کیا ہے اس قدر انسان ملکوں کی زندگی گزارنے اور گنوانے کے بعد بھی نہ کر پایا تھا۔ سیانے کہتے ہیں! زندگی کی تیز رفتاری اور چکا چوند کے علاوہ علوم و فنون شعر و شاعری اور رنگ و آہنگ میں بھی اس کرشماتی ڈبے سے بڑی مفید خدمات لی جا رہی ہیں! منٹوں اور سیکنڈوں میں ایک چھوٹے سے بٹن کی جنبش سے بڑے بڑے تخلیقی کارنامے انجام دے کر شہرت و ناموری کے ساتھ اعزازات و انعامات کی طویل قطار زرنگار دروں کی زینت بن رہی ہے۔

کر قطار لطف و انبساط ہے بٹن کی اس ہلکی سی جنبش میں! نہایت مہذب مستحیر اور بلند نگاہی کی حامل دنیا تمام تر ہوش ربائی کے ساتھ کرشماتی ڈبے کی سکرین پر نمودار ہوگئی ہے۔ نہ کسی کو غم روزگار کی فکر نہ محبوب کی بے وفائی کا گلہ! اعلیٰ طرز کی تعمیر کا نمونہ بڑی بڑی عمارتیں اور عالیشان دفاتر جن میں دنیا کے بڑے بڑے دماغ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے نقشوں میں رنگ آمیزی کرنے میں مصروف ہیں۔ کبھی کبھی کسی جگہ تہہ خانے اور تہہ حاشیے بھی بنائے جا رہے ہیں۔ کسی میز کے گرد بیٹھے لوگ جغرافیائی تغیر کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ کسی میز کے گرد دفاعی حکمت عملی ترتیب دی جا رہی ہے۔ کسی کے گرد بیٹھے لوگ جارحیت کا جواز تلاش رہے ہیں۔ کوئی ٹولہ خوراک کی ترسیل کا ذمہ دار ہے کوئی تجارت، کوئی باہمی میل ملاپ اور کوئی بیرونی رابطوں کو ترتیب دے رہا ہے۔ کسی کا موضوع سائنس اور ٹیکنالوجی، کسی کا نشر و اشاعت، کوئی معدنیات کا ماہر ہے کوئی ضرب و حرب کا مشاق غرض ہر کوئی کسی نہ کسی اہم ذمہ داری پر مامور ہے۔ دراصل یہ تمام اہم ذمہ داریاں یہ لوگ بہ حالات مجبوری نبھا رہے ہیں کہ ان کی برادری نے ان سولہ فیصد لوگوں کو اپنے حصے کی اکیاسی فیصد دولت سونپ کر تمام اہم معاملات سے عہدہ برآں ہونے کا بار ان پر لاد دیا ہے۔ چھوڑئیے بھی! ہم اور آپ اپنی جان کیوں ہلکان کریں! سر دست ہمارا منتہائے مقصود تو ایک کہانی ہے جس کے لئے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو ایک بار پھر اسی چھوٹے سے بٹن پر حملہ آور کرنے کے سوا کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا!

معاملہ یہاں بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قدرے جدا ہے۔ یہ لوگ اس بود و باش کے ہیں نہیں جس کا انہوں نے لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ کبھی ان کے چہروں پر خوشی اور اطمینان کے بجائے ایک طرح کا ہیجان اور بے چینی دکھائی دیتی ہے۔ ہر کوئی عجلت میں نظر آرہا ہے۔ ہر کسی کو کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کی جلدی ہے۔ یہاں اجتماعی سوچ کے بجائے انفرادی مفاد زیادہ عزیز گردانا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی عبادت گاہیں اور مکتب اہمیت کھوا بیٹھے ہیں۔ بیوٹی پارلر، ہیلتھ کلب، ڈسکو، قمار خانے، نائٹ کلب، شاپنگ مال، نئے ماڈل کی گاڑیاں، تنگ، چاک و اُڑے لباس اور آزادانہ اختلاط اس طرح شامل ہو چکا ہے کہ یہ اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی دور کی بینائی کمزور ہو چکی ہے انہیں صرف اپنے گرد و پیش کی خبر ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ ان کے لوگوں کو کس طرح موت کی وادی میں دھکیلا جا رہا ہے۔ کس طرح ان کو مطعون ٹھہرایا جا رہا ہے! یہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آنے والا کل اپنے دامن میں ان کے لئے کس طرح کے خطرات لئے ہوئے ہے۔ اس تمام منظر اور انتشار میں ان لوگوں کی ذہنی کیفیت سے نیا دھن کے ہاں موجود مساوات کا دل ہے کہ یہ آبادی کا، ننانوے فیصد ہونے کے باوجود صرف سولہ فیصد پر قادر ہیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں سوائے ایک کہانی کی تلاش کے جس میں ابھی تک کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا! ایک کوشش کم از کم ایک کوشش کہانی کی تلاش میں اور کرنا چاہئے!

اس بار کرشماتی ڈبے نے عجیب منظر دکھلایا ہے! بظاہر دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، دو کان، سب کچھ انسانوں جیسا ہے مگر ان کے چہروں پر بے بسی اور بے چینی اس شدت سے گھر کئے ہوئے ہے کہ انسان تو انسان اگر خالق انسان کی نظر پڑ جائے تو وہ بھی ایسا کچھ کر گزرے جو اس سے پہلے کسی نے دیکھا اور سنا نہ ہوا! یہ لوگ جن کی آنکھوں کے گرد گڑھے اور پسلیوں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں نہ مستقبل کی فکر میں پڑتے ہیں نہ ماضی سے انہیں کوئی سروکار ہے! ان کی تمام تر جستجو محض اور صرف دو وقت کے نان جویں پر ہے جو کبھی نہ ملنے کے برابر ہوا کرتی ہے! اس کے بعد ان کی توجہ کا مرکز ان کے بے لباس تن پر جاتی ہے جہاں صرف شرم گاہیں چھپانے کے لئے بے شرمی کی تمام حد پار کرنا پڑتے ہیں جہاں ایک دو روٹی دوا کے لئے، سو روگ تن کو لگانے پڑتے ہیں، جہاں پانی کی جگہ پیاس الکحول استعمال ہوتا ہے جسے ابھی تک جدید دنیا کوئی بھی نام دینے سے قاصر ہے، یہاں تعلیم کا تصور عیاشی سے مماثل ہے جس کا کثرت کو نام بھی معلوم نہیں، یہ لوگ تو اس امر سے بھی نا آشنا ہیں کہ کل آبادی کا اکیاسی فیصد ہونے کے باوجود ان کے حصے میں صرف تین فیصد دولت میسر ہے جس سے تن ڈھانپنا ہے نہ معدہ کی بھوک مٹتی ہے۔ یہ ان کی ناکامی نہیں ہم

سب کی ناکامی ہے جس میں ہماری ذات بھی شامل ہے جسے ایک کہانی فقط ایک کہانی کی تلاش نے کتنے زمانوں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا ہے! شاید! ایک کوشش اور کرنے سے کسی کی مراد مل جائے مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟ ہم نے تو دنیا کی ہر کھونٹ تلاش ماری ہے اب کونسا دیس کونسا ملک اور کونسا جزیرہ بچا ہے جس میں جا کر قسمت آزمائی کی جائے؟

ٹھہریے! ذرا ٹھہریے! کرشماتی ڈبے نے ایک نئے جہان نئی دنیا نئی مخلوق اور نئے لوگ متعارف کرائے ہیں! یہ اپنی طرز کی نئی دنیا نئی مخلوق اور نئے لوگ ہیں! آپ چاہیں تو انہیں ایک ملک ایک قوم سے موسوم کر سکتے ہیں! چاہیں تو انہیں کئی نسلوں اور گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں! یہ دنیا کی واحد مخلوق ہے جو ہر وقت ہر طرح کا رنگ روپ دھارنے کی قدرت رکھتی ہے! وقت کے سانچوں میں خود کو ڈھالنا ان کے فن کی معراج ہے! نامعلوم کرشماتی ڈبے کے فن پر ہماری نگاہوں کا دباؤ پڑا ہے یا کرشماتی ڈبے نے خود ہی خود ہم پر مہربانی کرتے ہوئے منظر بدل دیا ہے۔ ہمارا دل کہہ رہا ہے کہ اس بار ہماری ناکامی ضرور کامیابی میں بدل جائے گی ضرور ہمیں کہانی یا اس کا سراغ مل جائے گا!

یہ شخص جانا پہچانا لگتا ہے! مجمع کے بیچ اس کا خطاب اور لوگوں کا جوش و خروش کسی اہم واقعے کی نشاندہی کر رہا ہے! شخص مذکور ان لوگوں کا کرتا دھرتا، چوہدری، مکھیا یا سردار لگتا ہے! اس کا کہنا ہے کہ ایک ہی جست میں انہوں نے ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں بلکہ سات سیڑھیوں کی چھلانگ لگا کر برادری میں خود کو معتبر کر لیا ہے! اعلان کرنے کے بعد مکھیا، چوہدری یا سردار کے چہرے پر سرخی، گردن میں اکڑاہٹ، چھاتی میں ابھار اور آواز میں جوش نمایاں ہو گئے ہیں! ہمارا دل بھی چاہنے لگا ہے کہ ہم کہانی والی کے چکر سے نکل کر اس مجمع میں شامل ہو کر فتح و کامرانی کا جشن منائیں! ایک سو ستر کی گنتی میں ایک سو چالیس سے ایک سو پینتیسویں مقام حاصل کرنا، کسی بھی لحاظ سے غیر اہم واقعہ نہیں ہو سکتا!

یہ کیا؟ جوں جوں کرشماتی ڈبے سے ہماری شناسائی بڑھتی جا رہی ہے! ویسے ویسے کرشماتی ڈبہ شیطانی ڈبہ بنتا جا رہا ہے! اس بار کے منظر نامے کی تبدیلی میں ہمیں یا ہمارے جسمانی اعضا کو قطعی دخل نہیں ہے یہ صرف اسی شیطانی ڈبے کی بدنمائی یا بدبختی کی دلیل ہے جس کے لئے اس شیطانی ڈبے کو جس قدر بھی ملعون ٹھہرایا جائے کم ہے! نامعلوم شیطانی ڈبہ کس معاشرے اور کس ماحول کی تصویر دکھلانا چاہتا ہے جہاں! محافظ راہزن، مصلح مجنا بن گئے ہیں، معلم بیوپاری اور مبلغ دروغ گوئی کا شکار ہیں، محتسب مصلحت پسند، تجارت ذاکر زنی بن گئی ہے، دہقان مفلس، کھیت بنجر ہو گئے ہیں، ثقافت فحاشی، فن عریاں ہو گیا ہے، سیاسی بے لباس، ضمیر مردہ ہو گئے ہیں، حکمران جابر، عوام بے بس ہو گئے ہیں، منتخب رہنما، ذہن دولت میں کھیل کھیل رہے ہیں، ہزاروں روپے فی منٹ پر چلنے والا ایوان مچھلی بازار میں تبدیل ہو چکا ہے، پچاس لاکھ افراد زکوٰۃ پر گزارا کر رہے ہیں، ڈیڑھ کروڑ پڑھے لکھے افراد بے روزگاری کا شکار ہیں، ساٹھ لاکھ بچے علم حاصل کرنے کی عمر میں، نچلے درجے کے کام کرنے پر مجبور ہیں، لاکھوں افراد کچرا گھروں سے خوراک تلاش کر رہے ہیں، ایک تہائی آبادی ڈھور ڈنگروں کے ساتھ پانی پینے پر مجبور ہے، بھکاریوں کی تعداد ملک کی آبادی کا چھٹا حصہ ہو چکی ہے، چوری، ڈاکہ زنی، پیشہ بن چکی ہے جس سے ملک کی آبادی کا چوتھائی حصہ منسلک ہے، ایک کروڑ انسان، عدالتوں میں انصاف کے منتظر ہیں، صرف ایک صوبے کے پانچ ہزار سے زائد دیہات ہر طرح کے سکول، کالج سے محروم ہیں، مختلف مافیاؤں اور قبضہ گروپوں نے علیحدہ علیحدہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر کے عوام کی بے بسی کو بے توقیری میں بدل دیا ہے، آبادی کا چالیس فیصد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے، سوسائٹی کا حسن توازن سے باہر ہو چکا ہے، آئین وقت کو شوکیس کے ڈبے میں جگہ مل چکی ہے، انتخابات سے اعتبار اٹھ رہا ہے، عدلیہ سے امیدیں ٹوٹ چکی ہیں، مالی اداروں کو گروی کے لئے پکارا جا رہا ہے، ازلی دشمنوں سے وفا کی امیدیں باندھی جا رہی ہیں، ابدی دوستوں کو بے وفائی کی آگ میں جھلسایا جا رہا ہے، محبت کے مفہوم اور بے وفائی کی نئی تعبیریں تراشی جا رہی ہیں، اندھیروں سے روشنی طلب کی جا رہی ہے، اجالوں سے منہ موڑا جا رہا ہے، خرد کو جنون، جنون کو خرد بتلایا جا رہا ہے!

توبہ توبہ لاحول پڑھتے ہم بھی آئندہ کے لئے اس شیطانی ڈبے سے دور رہنے کے وعدے کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی طلب کر کے آپ سے رخصت چاہیں گے اور آپ کے اس وقت کے لئے بھی معذرت طلب کریں گے جو کہانی کی تلاش میں فقط ایک کہانی کی تلاش میں آپ کو ضائع کرنا پڑا مگر ٹھہریے......! ایک سوال فقط ایک سوال اس انجانی مخلوق سے کرنے کی اجازت مرحمت فرمایئے! کہانی کا کیا ہے کبھی بھی کہیں بھی مل سکتی ہے نہ بھی ملی تو کون سی قیامت برپا ہو جائے گی؟ دنیا کے کتنے لوگ ہیں جو کہانی تو کیا عنوان کے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر ہم ایک سو ستر کی بھیڑ میں ایک سو پینتیسویں مقام حاصل کرنے پر خوشیاں منانے والی انجانی مخلوق سے یہ ضرور دریافت کرنا چاہیں گے کہ چند برسوں! آپ کو حق ہے آپ اس مقام معتبر کی نسبت جس قدر چاہیں خوشی کا اظہار کریں ضرور بتلا دیجئے کہ اس گنتی کے الٹا ہونے کی صورت میں، آپ اپنے لئے کس مقام کی تمنا کریں گے؟؟؟

کہاں کچھ یاد رہتا ہے

ستیہ پال آنند

کہاں کچھ یاد رہتا ہے
کہ میں نے اس پرانی ڈائری میں
کون سی تاریخ کے صفحے کا کونا
موڑ کر کچھ لکھ دیا تھا چند سطروں میں
کہ شاید یاد رہ جائے
کوئی اک نام، چہرہ
جسم کی جیومیٹری کے زاویے، قوسیں!

کنواری دھوپ وہ کیسی تھی، جس نے
ڈائری کے کورے صفحے کو
بسنتی رنگ کی کرنوں سے نہلا کر سجایا تھا؟
نشاں زدلائنوں میں درج کیا کچھ تھا
سیاہی مٹ چکی ہے اب
کوئی اک واقعہ جو چاند کی چاندنی میں پگھلی
رات کے سیمیں کٹوروں سے چھلکتی
گرم ٹھنڈک بھر گیا تھا میری نس نس میں؟

کہاں کچھ یاد رہتا ہے
کوئی بک مارک بھی ایسا نہیں
جس پر کسی کا نام لکھا ہو
کوئی اک نام.....
جو اس پھولتی سرسوں سے پیلی صبح کا
یا چاندنی کی گرم ٹھنڈک کا
مجھے پھر ذائقہ دے کر کہے..... تم جانتے تو ہو
تمہاری ان دنوں جوبن کی رُت تھی، ستیہ پال آنند!

بڑھاپے میں کہاں کچھ یاد رہتا ہے!!

No Man is on Island

ہر طرف گہرا سمندر
اور بیچوں بیچ اس گہرائی سے جیسے ابھرتا
اک جزیرہ
خوشنما، سرسبز، پیڑوں، پنچھیوں، پھولوں، پھلوں کی
غیر ارضی ایک جنت!
ساحلوں پر جھاگ اڑاتی
لیس ہتھیاروں سے نا ہموار نوکیلی چٹانیں
صف بہ صف ایسے کھڑی ہیں
مستعد پہرے پہ جیسے فوجیوں کی ٹولیاں
اس کی حفاظت کر رہی ہوں!
بھولی بھٹکی کوئی کشتی
بے سہارا، بے اماں، جائے تحفظ ڈھونڈتی
اپنے دریدہ بادبانوں کے سہارے
آ بھی جائے، تو یہ پہرے دار اس کو روک دیں گے
اس لیے برسوں سے کوئی
اس جزیرے پر نہیں اترا.....
کسی نے اتنی ہمت ہی نہیں کی!

کیوں بھلا یہ میرے "میں" کی
غیر ارضی، خوشنما، سرسبز جنت
اپنے چاروں سمت پھیلی
بیکراں سچائی سے کٹ کر کھڑی ہے؟

میں یہ خود سے پوچھتا ہوں!

مَیں نے پڑھنا سیکھ لیا ہے

نَیر جہاں

مَیں نے پڑھنا سیکھ لیا ہے
چاہت میں ڈوبے چہروں کو
مہر و وفا کی تصویروں کو
عدل انصاف کی تحریروں کو تقریروں کو
آوازوں کو اور لہجوں کو
آنکھوں میں لکھے جذبوں کو
مَیں نے پڑھنا سیکھ لیا ہے
جب سے پڑھنا سیکھ لیا ہے
تب سے میرے اندر
خوف کی چڑیا.....
سہمی سہمی۔۔تنہائی کی ڈال پہ بیٹھی
کانپ رہی ہے اور بسیرا ڈھونڈ رہی ہے
کوّے، چیل اور گِدھ افلاک پر
اور زمیں پر
چاروں جانب صرف درندے گھوم رہے ہیں
میرے اندر دکھ کا سمندر جاگ اُٹھا ہے
کیا کیا چکنا چور ہوا ہے
خوف سے مَیں خود بھی لرزاں ہوں
سوچ رہی ہوں
میرے کاندھوں پر بھی جانے
کتنے چہرے آویزاں ہیں
سوچ رہی ہوں میرے علاوہ
اور کس کس نے کتنا پڑھنا سیکھ لیا ہے؟

روز روز کیا مرنا

عبدالرحمان عبد

روز روز کیا مرنا
مشکلوں سے کیا ڈرنا
زندگی کے رستے میں مشکلیں تو آتی ہیں
نو بہار فردا کی حسرتیں رُلاتی ہیں'
ان کی فکر کیا کرنا
جو بھی مشکلیں آئیں' دن گزر ہی جاتے ہیں
جس قدر بھی گہرے ہوں زخم بھر ہی جاتے ہیں
اشک گر کے بھی اپنا کام کر ہی جاتے ہیں۔
روز و شب ہیں جیسے بھی' ان سے دوستی کر لو
اوٹ لو محبت کی' پیار زندگی کر لو
قدر یا کی جانو' پیار ہی سبھی کچھ ہے
پیار زندگی میں گر' ہے تو زندگی کچھ ہے
اجنبی زمانوں کا انتظار کیا کرنا
بے ثبات سانسوں کا اعتبار کیا کرنا
زندگی کے رستے میں مشکلیں تو آتی ہیں
مشکلوں سے کیا ڈرنا
روز روز کیا مرنا

اگر یہ زندگی ہے!

رفعت سروش

نہیں ممکن کہ تم آ جاؤ واپس اپنے اس گھر میں
مگر دل چاہتا ہے تم یہیں میرے قریب ہوتیں
سنہری دھوپ میں ہم بیٹھ کر باتیں کیا کرتے
گئی ہو جب سے تم، ہاں چاندنی راتیں نہیں ہوتیں

تمہارے درد کی سوغات ہے محفوظ سینے میں
تمہاری یاد میں آنکھوں کے دیپک جھلملاتے ہیں
برستی ہے گھٹا، شق ہوتا ہے بادل کا جب سینہ
مری پلکوں پہ تارے جھلملا کر ٹوٹ جاتے ہیں

وہی ہے درد کی شب اب بھی، وہی معمول ہے گھر کا
مگر اک بے نیازی سی سرایت کر گئی مجھ میں
میں اک روبوٹ ہوں، چلنا مقدر ہے مرا لیکن
میں سب کے ساتھ ہوں، پھر بھی ہے سب سے بےرخی مجھ میں

اداسی کے رشتے میرے ہر دم ساتھ رہتے ہیں
اگر یہ زندگی ہے، موت آخر کس کو کہتے ہیں

دِل کے آر پار اِک تیر

دِل نواز دِل

سب یہی کہتے ہیں
میرے گاؤں سا
کوئی بھی اک گاؤں نہیں
سب یہی کہتے ہیں
میرے گاؤں کے
پیپل کی چھاؤں
سے گھنی چھاؤں نہیں
سب یہی کہتے ہیں
اُس اک سار کے
پاؤں سے بڑھ کر
آتشیں پاؤں نہیں
سب یہی کہتے ہیں
اک دریا کنارے بیٹھ کے
اس پار گاؤں
اور چھاؤں
اور حسیں پاؤں میں
لیکن
آر کوئی
ایک بھی ماؤں نہیں!!!.....

نئی تاریخ لکھنی ہے

سید عارف

دل آئینوں سے
جب خوابیدگی کا زنگ اترتا ہے
گماں کی گرد جھڑتی ہے
فصیلیں خوف کی مسمار ہوتی ہیں
فضائے جاں میں جب
بیداریوں کی خوشبوئیں تحلیل ہوتی ہیں
ہراس و یاس کی یخ دھند میں لپٹی ہوئی
شجر رُتیں جب کوچ کرتی ہیں
تو کتنے گنگناتے مسکراتے جگمگاتے
موسموں کے عکس ابھرتے ہیں
کئی منظر سنورتے ہیں
دھنک رنگوں میں ڈھلتے ہیں
سم اندوہ کا تریاق ملتا ہے
نمو کی خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی ہیں
سرِ شاخِ سکوتِ زیست
جب کوئی گُل آواز کھلتا ہے
نئے لہجے مہکتے ہیں
عزائم کے نئے آفاق ابھرتے ہیں
مقفل آرزوؤں کو نیا پیراہن اظہار ملتا ہے
جلالِ عزت و پندار ملتا ہے
کہانی کو نیا کردار ملتا ہے
غبارِ راہ چھٹتا ہے
تو کتنی منزلیں لو دینے لگتی ہیں
سفر کے استعارے ملنے لگتے ہیں
سفینوں کو کنارے ملنے لگتے ہیں

شبِ تاریک کے پاتال سینے سے
طلوعِ صبحِ روشن کے اشارے ملنے لگتے ہیں
تجلی کے حسیں چشمے ابلتے ہیں
اجالے پھیلتے ہیں
روشنی کے پھول کھلتے ہیں
تھکے ہارے ہوئے جذبے نئی کروٹ بدلتے ہیں
ہر اک حرفِ دعا پیہم ریاضی کے در پے کھلنے لگتے ہیں
نئی دھج سے جنم لیتے ہوئے لمحے
نئی تاریخ لکھتے ہیں
ہمیں بھی روز و شب کے گوشوارے کے لئے عارف
کسی ایسے ہی زندہ لمحہ پُر نور کو تسخیر کرنا ہے
خواب کو تعبیر کرنا
صورتِ حالات کو زنجیر کرنا ہے
جبینِ وقت پہ حرفِ ابد تحریر کرنا ہے
اور اپنے چار سُو پھیلے ہُوئے بے ہمتوں کے
دشت سے باہر نکلنا ہے
فریبوں کی چٹانیں توڑنی ہیں
اک نئے عزمِ سفر سے جگمگاتے
قافلے ترتیب دینے ہیں
تمناؤں کی ہر شاخِ برہنہ کو گلابوں کا نیا ملبوس دینا ہے
ہر اک کو شبِ تیرہ کو ریزہ ریزہ کرنا ہے
ہر اک ساعت کے سر پر چادرِ انوار رکھنی ہے
نئے ادوار کے در باز کرنے ہیں
نئی تاریخ لکھنی ہے

دہشت گرد طالب علموں کے نام

قیصر نجفی

میرے ماحول کے تقدس کو
تم پراگندہ کر نہیں سکتے
جا بجا قطرہ ہائے خوں کی طرح
دُرِّ دانش بکھر نہیں سکتے
گولیاں داغنے سے کیا ہو گا
حرف گولی سے مر نہیں سکتے

مجھ کو معلوم ہے کہ تم اپنی
چھوڑ کر آئے ہو کتاب کہاں
کس نے پکڑائی ہے تمہیں بندوق
کس کی منہ میں لئے ہوئے ہو زباں

وہ بھی دن تھے کہ ان فضاؤں میں
تم چہکتے تھے جگنوؤں کی طرح
زندگی کے تمام رنگ لئے
اڑتے پھرتے تھے تتلیوں کی طرح
یہ فضائیں تو ہیں وہی لیکن
تم نے اپنی چمک گنوا دی ہے
تم ہی بتلاؤ زندگی اپنی
تم نے بے رنگ کیوں بنا دی ہے
ایک بندوق کے عوض شاید
تم نے ہر ایک شے گنوا دی ہے
علم، احساس، آگہی سب کچھ
روشنی، رنگ، زندگی سب کچھ

مراۃ الموت

خیال آفاقی

اہل خرد سے ہو نہ سکی شرح کائنات
لیکن جنوں نے کھول دیا عقدۂ حیات

لفظِ الم کے شرح و معانی بھی لخت لخت
دل اور درد دونوں حروف مقطعات

یہ کس نے میرے فکر و نظر کو بدل دیا
سب سے جدا خیال، الگ ہیں تصورات

میرے لہو کی خیر، میری گرد بھی نہیں
مانا بڑی حسین ہے تصویر کائنات

اے ضبط ایسے دل کو ادب سے سلام کر
گم ہو گئے ہوں جس کے تبسم میں حادثات

نغمہ سرا ہے آج تری انجمن تمام
ماتم کناں ہے میری تمناؤں کی برات

کب تک یہ روز و شب کے سفید و سیاہ کھیل
کب تک یہ نجم و شمس و قمر کے تغیرات

کب ختم ہو گی لوح و قلم کی یہ داستاں
کب تک سکوں محال، کہاں تک یہ حادثات

ہے جستجو فنا کو ازل سے کہ دیکھ لے
اپنی نظر سے اپنے خط و خال بے ثبات

کرتی ہے جب نگاہ نگر اپنے آپ پر
دیکھا ہے ٹوٹ جاتا ہے آئینۂ حیات

دہلیز کی ناک

پروفیسر زُبیر کنجاہی

اُس نے مجھ سے خط مانگے ہیں
مانگی ہیں تصویریں
میرے سارے ناطے مجھ کو واپس کر دو
واپس کر دو اُن لمحوں کو جن میں مَیں نے
گیت سُنے تھے پھول چُنے تھے
پھر رو رو کر اُس نے اپنے ہونٹ ہلائے
خود سے باتیں کر کے بولی، تم سے مجھ کو پیار نہیں ہے
جو کچھ میں نے خط میں لکھا
وہ اِک وہم تھا، جھوٹ نہیں تھا
مَیں تو سب کچھ بھول چکی ہوں، اپنی آنکھیں کھول چکی ہوں
میری بہنیں اشک بہائیں
بھائی سوچیں آنکھ دکھائے
ماں کی نبضیں پَل پَل ڈوبیں
باپ لہو کے گھونٹ نگل کر سو جاتا ہے
مَیں بھی اَب تو سوچ رہی ہوں
اِس الجھن سے میرے گھر کی ناک ہی شاید کٹ جائے گی
عزّت خاک میں مِل جائے گی، ساری دولت بٹ جائے گی
گھر کی عزّت!
جس کو میرے باپ اور ماں نے اپنے سُکھ کے سپنے دے کر
ارمانوں کے تیور دے کر اپنے خون کے زیور دے کر
اِک متوالا محل سجایا
وہ متوالا محل تمہارے زور جنوں سے ڈھے جائے گا
طعنوں کے سیلاب میں شاید بہہ جائے گا
مَیں بیٹی ہوں مَیں عورت ہوں
میرے مُنہ پر "چُپ" کا تالا رمزوں کا انبار لگائے
میرے جیسی لاکھوں جانیں بجھتے جلتے ارمانوں کی بھینٹ چڑھی ہیں
میں لکڑی ہوں میرا کام سُلگتے رہنا
مَیں اِک بھیڑ ہوں میرا کام بِکتے رہنا
مَیں بیٹی ہوں مَیں نے گھر کی ناک کا پرچم اونچا رکھا
تم بھی میری ناک کا پرچم عزّت کی دیوار پہ اونچا رہنے دو

ایٹمی جنگ

ڈاکٹر حنیف ترین

کمپیوٹروں میں لال بتی جل چکی ہے
اپنے ٹھکانوں سے
چلی پھر موت اپنے جبڑے کھولے
میزائلوں
بمبار طیاروں میں ایٹم بم اُٹھائے
دندناتی گڑگڑاتی
فاصلے برسوں کے منٹوں اور سکنڈوں میں طے کرتی
..................خوف برساتی
گری مخصوص......باغی......منحرف احمر ٹھکانوں پر
جہاں پر حکم سے انکار چکا تھا
خطرۂ یلغار اپنا تھا
..................اچانک..................
گھنی آبادیاں صحرا......زمیں پر جھولتے جنگل
امنگیں، پیار، خوشیاں، زندگی کے ولولے
سسک کر خاموش ہو گئے ہیں
ابدی نیند سو گئے ہیں
اپنا تک گرد میں سُو اڑ رہی ہے
بھیانک چھتریوں میں ڈھل رہی ہے
سمندر بھاپ بن کر اڑ رہے ہیں
پہاڑوں کے بدن ریزے ہوئے ہیں
فضا میں تابکاری کا دھواں ہے
اور رقصِ موت ہر سُو
ہدف سے حملہ آور تک رواں ہے!!

اپنی تہذیب کی تلاش

سجاد مرزا

فریب گاہ جہاں میں ہم نے
بہار بخشی تھی زندگی کو
سلگتے لمحوں کو تازگی دی
دلوں میں انسانیت جگائی
نکھار بخشا فسردہ چہروں کو
اور آنکھوں کو روشنی دی
اور احترام آدمی کا ہم نے
یہاں کے لوگوں کو تھا سکھایا
اور اک نئی گنگا جمنی تہذیب
ارضِ مشرق کو ہم نے بخشی !
وہ جس کو ہند اسلامی تہذیب
اہلِ رائے بھی کہہ رہے ہیں!

میں سوچتا ہوں وہ اہلِ مشرق
ثنا گرانِ بہار اُلفت
کہاں گئے، ہم کو کلفتوں کے
مہیب جنگل میں چھوڑ تنہا؟

ہم اپنے ہونے کی اب گواہی
کسی سے لیں بھی تو کس طرح لیں؟
ہم اپنی تہذیب کو بھلا کر
بھٹک رہے ہیں خلا میں ایسے
کہ جیسے ذرے زمیں سے اٹھ کر
فضا میں پرواز کر رہے ہوں!

ہماری تہذیب کے مہکتے ہوئے
وہ گلزار اب کہاں ہی

Connecting Flight

فیصل عظیم

گھر مشرق میں
ہم مغرب میں
جسم سرائے جیسا ہے اب
دولت کیا گل کھلوائے گی
ہم تو خبر سے بستر پر ہیں
لیکن روح ابھی تک گویا رستے میں ہے
انجانے سے ایک ہوائی اڈے پر
گم صم بیٹھی ہے
اور اگلی پرواز کا بھی اعلان
ابھی ہونا باقی ہے

زندگی

اکرام تبسم

کرے تقدیر ادب جس کا
نقیبِ وقت لقب جس کا
وہ لمحہ لمحہ زندہ ہے
ہواؤں سے ٹکرانا
رہے گا یہ آنا جانا
کہ رستہ رستہ زندہ ہے
لکھا ہے خون کی دھاروں پر
کیا تھا جو تلواروں پر
وہ سجدہ سجدہ زندہ ہے
رہا جو رحمت کا جو یا
طور سے بندے کا گویا
ہے جو بھی رشتہ زندہ ہے

ٹاہلی دے اوہلے بیہہ کے

پدما سچدیو

(ترجمہ: نورجہاں ثروت)

مسافروں سے بھرے جہاز میں ایک بچے کی پیاری آواز پروائی کی طرح خوشگوار ہوئی۔ 'اب جہاز اڑے گا' یہی آواز کہیں سے بھی نہیں آئی مگر ایئر ہوسٹس کی آواز گونجی 'بسم اللہ الرحمن الرحیم' السلام علیکم---خواتین و حضرات' اب ہمارا جہاز لاہور کے لیے روانہ ہو رہا ہے---پاکستان کی تمام اڑانوں پر تمباکو کی ممانعت ہے۔

اردو سن کر جی جڑ جاتا ہے' جیسے اپنے آپ کو بہت دنوں بعد دیکھا ہو---اپنی بولی محبت کی بولی' نہ اردو نہ ہندی' نہ ہندستانی---!

اردو مجھے بہت اچھی لگتی ہے' یہ نہ صرف تہذیب و تمدن کی زبان ہے بلکہ محبت کی زبان بھی ہے---ایک خوبصورت دھن ہو جیسے---پہلے ستار کی دھن پھر بانسری اور پھر ڈھولکی کی دھن---جہاز میں بج اٹھی ہے---جہاز اڑ چلا ہے مجھے اپنی ماں کی آواز جیسے سنائی دیتی ہے---'' اے کڑیے تیری کھلوی ہے ڈاری اے' جب تم میرے پیٹ میں تھیں تو تمہارے پتاجی مجھے لاہور دکھانے لے گئے تھے۔ ہوا تو کیا میں اب تک ماں کے پیٹ میں ہی تھی---آج پیدا بھی ہوئی ہوں۔ کہتے بھی تو ہیں---جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جیا ہی نہیں---(جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا) لاہور کے دیوانے تو کم سے کم یہی کہتے ہیں---

حجاب قزلباش پاکستان کی شاعرہ کہلاتی تھیں پر پیدا دلی میں ہوئی تھیں۔ بٹوارے کے وقت نانو نسر تھیں۔ دلی کلاتھ مل والوں کے مشاعرے میں ان کا یہ شعر کس کس کو نہ رلا گیا:

دل میں یادوں کے فسانے
اے وطن آئے تیرے دیوانے

ان کا گھر بٹوارے سے پہلے کا ہندستان تھا---ہائے ری حجاب آپا پاکستان جا کر بھی ستا کر اب وہ نہیں رہیں۔

جہاز کی کھڑکی کے باہر آسمان اپنی نیلی رنگ بکھیرنے کے بعد حیران سا کھڑا ہے۔ دلی دور ہو چکی ہے---ایک کڑھائی کی ہوئی خوبصورت چنائی کی طرح لاہور نیچے زمین پر بچھا پڑا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھر' باغ' پانی' ہریالی---یہی لاہور ہے۔ اونچی عمارتوں کے کبوتری ڈربے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ زمیں کا کس نے ملا تو کیا ملا!

ہوائی اڈے سے نکلنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اڈے کے باہر پہلے گیندے کی مالائیں لیے لکھک' دوست' ٹی وی اور اخباروں کے رپورٹر---ہار بہت زیادہ---میں نے بھی گلے میں ڈال لیے ہیں۔ یہ ساری بھیڑ اردو کے روح رواں گوپی چند نارنگ کے لیے ہے۔ کچھ رپورٹر ہماری طرف بھی آئے ہیں۔ ایک خاتون پوچھتی ہیں۔ ''آپ پہلی بار آئی ہیں؟'' ابھی تو کہتی ہوں---ہاں پہلی بار ہی آئی ہوں---ان کی سوالیہ نگاہوں کا جواب میں دیتی ہوں۔ میں ڈوگری زبان کی شاعرہ ہوں' ہندی مصنف ہوں--- پاکستان آنے کا بہت اشتیاق تھا'---

ایک لمبا اونچا گورا سا لڑکا آ کر کہتا ہے' مجھے آپ کو ہوٹل لے جانا ہے' تو چلو کہاں ہے تمہاری گاڑی؟ وہ سٹیرنگ پر بیٹھ جاتا ہے میں آگے اسی کے ساتھ بیٹھتی ہوں---اتنا سندر لڑکا دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں---

'آنٹی آپ پہلی بار آئی ہیں نا؟'---'ہاں بیٹا! اسی لیے میں لاہور کو دیکھوں گی نہیں پیوں گی'---'آنٹی! میں آپ کو شہر دکھاتا ہوا لے چلتا ہوں کیونکہ بہت بڑا میاں کان ہے'---راستہ دکھانے والا بیٹا آنٹی سے منسلک نہیں---کتنا کچھ دے گئے ہیں انگریز بھی---اس میں آنٹی بھی ہے نا!---وہ مجھے ماں کی کہنے لگتا ہے۔ ابھی ابھی پیدا ہوئے میرے بیٹے کا نام منصور فیروز خاں ہے---جیو میرے لال---!

ہالی ڈے ان کافی عالیشان ہے۔ ایک طرف لمبا چوڑا سا ڈائننگ ہال ہے جہاں لاجواب کھانے ہیں---دلی میں باقی کے لوگ بھی آ گئے ہیں۔ اپنے اپنے کمروں میں جا رہے ہیں انہیں چھوڑنے آئے لڑکے منصوریاں کے دوست ہیں۔ ان میں ایک ایم پی ہے باقی زیادہ تر وکیل ہیں۔ سب ہی مجھے اوپر چھوڑنے آئے ہیں۔ کمرہ بھر گیا ہے' گپ بازی شروع ہو گئی ہے' گپ بازی میں یہ چھوکرے میرا کیا مقابلہ کرتے

گپ بازی کے بیچ چائے بھی آ گئی ہے اس کا بھاری بھرکم بل منصوریاں نے ادا کیا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں ان لڑکوں کو کوئی فکر نہیں ہے۔ خوش باش اور بے نیاز! ابھی تک کسی کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ مالک انہیں ہمیشہ خوش رکھے!

ان کے جانے کے بعد میں نے کھڑکی کے پردے کھولے ہیں۔ سامنے ایک نہایت شاندار بلڈنگ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خوب لمبی چھریری و خوبصورت ناری باہوں نے اسے ہاتھوں پر اٹھا رکھا ہو۔ یہ کاریگری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ پتا چلا یہ بلڈنگ علامہ اقبال کی یاد میں بنائی گئی ہے---اقبال صاحب! اب بھی سارے جہاں سے اچھا ہمارا ہندوستان ہی ہے۔

لوگ کے چلے تو گئے ہیں مگر کمرہ ابھی ان کی شادمانی کی خوشبو سے بھرا ہوا ہے۔ میں اپنے ساتھ اردو اور انگریزی کی کچھ کتابیں لائی تھی جو مابعد جدیت کی ہیں۔ ہندی یہاں بہت کم لوگ پڑھتے ہیں یا شاید پڑھتے ہی نہیں!

اگلے دن تین تاریخ کو لاہور میں بین الاقوامی کتابوں کے میلے کا افتتاح ہے۔ پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل خالد مقبول اس کا افتتاح کرنے آئے ہیں۔ ہندوستان کے کئی چہرے یہاں چمک رہے ہیں۔ یہ چمک ادیبوں کے لفظوں کی لڑیوں سے ملی ہوگی۔ خوشی ہوتی ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہے۔ ہم لوگوں کو بہت عزت و احترام سے بٹھایا گیا ہے۔ پروگرام بہت عمدہ ہے۔ ایوارڈ پانے والوں میں ہمارے سانگ صاحب بھی ہیں۔ ان کی بیوی نورما کا حسین چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے۔ کتاب میلے میں ساہتیہ اکادمی کا بھی اسٹال ہے۔ اردو کی کتابوں کی کتابت بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ میلہ بھر گیا ہے۔ حسین عورتیں، ماسٹرنیاں، طالب علم ---- ماسٹرنیوں میں کئی سندر کالے برقعوں میں ہیں۔ لڑکیوں کی قطاریں لگی ہیں۔ ایک موٹی لڑکی جو شاید ماسٹر ہے، اس میں ماسٹرنیوں کے سارے گن ہیں۔ میں سوچتی ہوں بڑی ہوکر یہ بھی ماسٹرنی ہو گی۔ میں تھک کر ایک اسٹال کے پاس کھلی جگہ میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر تماشائے اہل کرم دیکھ رہی ہوں۔ بہت ہی ساتھ والے اسٹال سے بڑے زور کے دھماکے کی آواز آتی ہے۔ پتا چلا کوئی بڑا شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔ شکر ہے کسی کو چوٹ نہیں آئی، پر شیشہ بھی ٹوٹے اور کسی کو لگے بھی نہیں تو کیا فائدہ!

ایک طرف ہردل عزیز نامی شاعر احمد فراز لوگوں کے گھیرے میں اپنے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے ہیں۔ شیشہ ٹوٹنے کا شاید انہیں پتہ ہی نہیں چلا شاعروں کو شیشہ ٹوٹنے کا پتا چلتا بھی کہاں ہے؟!

اس کے بعد ہم پاکستان کے پریس کلب میں گئے ہیں۔ لوگ استقبال میں کھڑے ہیں ---- بڑا سا ہال ---- ہم لوگ بیٹھ گئے ہیں۔ ابھی سانگ صاحب نہیں آئے۔ تھوڑی گپ بھی چل رہی ہے۔ سب اردو بول رہے ہیں۔ ایک آواز آئی او ئے یار پنجابی بول سچ بھی لگے (یار پنجابی بولنا کہ سچ بھی لگے) بات فرید پر ہو رہی تھی۔ ایک آواز آئی تھی فرید کے کیا کہنے! وہ تو ابھی تک نہ بانٹ سکا۔ ایک اور آواز ادب میں تجربے ضروری ہیں، ادب زندگی کے لیے ہوتا ہے کوئی بھی بڑا ادیب اسٹیبلشمنٹ کا دم چھلا نہیں ہو سکتا۔ سب جگہ ترجمے کا زور ہے یہاں پاکستان میں ایک امن دستہ بھی ہے جو امن تو چاہتا ہی ہے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہے کہ ڈیفنس بجٹ کی جگہ کتابیں یا تب ایک امن فیسٹیول بھی ہو رہا ہے اب امن کی بات مکمل ہونے لگی ہے۔ ایک خاتون نے مسکرا کر پوچھا پاکستان میں کیسا لگ رہا ہے۔ میں نے ہنس کر جواب دیا ”بالکل ہی نہیں لگ رہا کہ کسی دوسرے ملک میں آئے ہیں یوں لگتا ہے جیسے ماں نے اپنی گود میں سے اٹھا کر پڑوسن کی جھولی میں ڈال دیا ہو۔“

میں سوچتی ہوں ہم لوگ کس قدر جڑے ہوئے تھے۔ بٹوارہ بھی ٹھیک نہ ہو سکا تھا۔ اس ہندوپاک میں بری طرح سے بچھڑے۔ اب ملنے میں بھی مشکل نہ ہوگی۔ جب منصور نے مجھے ماں جی کہا تھا تب جیسے پاکستان بچے میں بدل گیا تھا اور میں اسے آنگن میں کھیلتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

راستے سندر ہیں، درختوں پر کئی رنگوں کے پھول کھل کر بہار کے آنے کا ذکر چھیڑ رہے ہیں۔ شاید بہار آ گئی ہے۔ میر کہتے ہیں۔

اے میر عشق پیچاں اک موج نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

بہت جڑتی کے پھول اپنی مہک سے آس پاس کی مہک کو معطر کر رہے ہیں۔ لاہور مہک رہا ہے۔ لاہور کا ذکر میں نے سب سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی کے پیدا ہونے پر سنا تھا۔ وہ ماشاءاللہ اگلے مہینے ریٹائر ہو رہا ہے۔

آج چار مارچ ہے۔ ایک چھوٹی بس میں سوار ہوکر لاہور دیکھنے جا رہے ہیں۔ مال روڈ کناٹ پلیس کی طرح ہے۔ آگے لاہور ہائی کورٹ ہے، یہاں برسوں پہلے عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو پر عریانیت کے الزام کا مقدمہ چلا تھا۔ عصمت آپا کا ”لحاف“ اور منٹو کی ”بو“ آپا کہتی تھیں ہائی کورٹ سے آ کر میں اور منٹو صاحب انارکلی سے جوتے خریدنے گئے تھے۔ میں نے بھی فرض کر لیا تھا ”اس کے بعد جوتے ہی خریدنا چاہیے تھے۔“

لاہور کا سب سے بڑا پوسٹ آفس پرانی انارکلی(نئی انارکلی) سڑک کے بیچوں بیچ کیا شاندار توپ تھی۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا مہاراجہ رنجیت سنگھ دکن سے یہ توپ چھین کر لائے تھے۔ وارث شاہ کا مزار، خواجہ گیٹ اور اسلامیہ کالج ---- کالج میں بلراج ساہنی اور دیو آنند بھی پڑھتے تھے۔ ڈی اے وی کالج لاہور میں میرے چاچا جی پڑھتے تھے۔ پرانا ہوگیا ہے، اب وہاں کچھ اور بن رہا ہے۔ ڈرائیور نے ہی بتایا تھا۔ اصل میں ڈرائیور بڑا ہی دوست قسم کا پنجابی تھا۔ اس کی سادگی بھی ہی رہی۔ اس نے ایک کیسٹ بھی لگا دیا تو میں نے کہا گانا سنوں یا لاہور دیکھوں، دونوں ہی سندر ہیں ---- اس نے تپاک سے کیسٹ بند کر دیا۔ پہلے ہی دن جب ہماری گورنر ہاؤس میں چائے کی دعوت تھی، تب گاڑی سے اتری تو بولا آپا یہ بلڈنگ، یہ باغ سب انگریزوں کے بنوائے ہوئے ہیں! واقعی عالیشان تھا گورنر ہاؤس، کھانے کے کیا کہنے، گوشت، گوشت اور بس گوشت! جہاں بھی تھوڑا گھاس پھوس ہوتا بیٹھ رہی ان پر پل پڑتے۔ ڈرائیور نے گاڑی آہستہ کی اور بولا ---- آپا حضرت داتا گنج بخش کا مزار دیکھیں ---- ابھی ادھر دیکھ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی، لاہور داتا کی نگری کہلاتا ہے، یہ جو اتنے کبوتر ہیں، یہ فرشتے ہیں جو یہاں ہر وقت سایہ کیے رہتے ہیں۔ چونکہ داتا صاحب ہر کولے روڈ والے کے ہیں!

اب ہم بادشاہی مسجد دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہر طرف سے پاکستان کا

مکمل 'مینار پاکستان' دکھائی دے رہا ہے' یہ منٹو پارک میں ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ رنجیت سنگھ کی سمادھی۔۔۔ بڑا ہرا دالان' پرسکون مقام' بیٹھ کر ستانے کو جی چاہ رہا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاہی مسجد بھی ہے' جیسے چاندنی چوک میں مندر' مسجد' گوردوارہ سب ہی ہیں۔ وہاں پانچ بجے بادشاہی گوردوارہ میں' میں اور ستورا گئے' وہاں بھائی صاحب نے لنگر کھانے کی دعوت دی' پر چونکہ سب لوگ بس کی طرف جا رہے تھے ہم نے پرشاد پر اکتفا کیا۔ بس کے باہر سب گاجر سوجی کی چاٹ کھا رہے تھے کمبخت ہمیشہ ہی لذیذ ہوتی ہے۔ گوردوارہ جنم سنگھ دیوی کے گوردوارے میں گویا بذات خود گوروجی براجمان تھے۔ ستورا کن کی بہت صاف اور سیدھی سے دھو تو روحانی طور پر مست ہو گئیں۔ انھیں دیکھ کر میں نے سوچا کیسے کیسے عالم لوگوں کو کیسی اچھی بیویاں مل جاتی ہیں۔ سانگ صاحب خوش قسمت تو ہیں ہی' کوئی شک؟۔۔۔ لوٹ کہا ہم پر بنا بیا ہوا۔۔۔ اوپر سے دیوان عام۔۔۔ خوب بنا بنا بند حار رہا ہے بادشاہ کے تخت پر کبھی کبھی سوچ کر جاتی ہوگی آج پھر بڑ بڑ تصویریں کھنچوا رہے ہیں۔ قلعہ میں بادشاہ کی پانچ خواب گاہیں ہیں۔۔۔ میں سوچتی ہوں آج بادشاہ کو کونسی خواب گاہ چاہیے ہوگی؟ بارہ دری میں بارش دیکھنے کے لیے ایک باغ ہے بھی۔ باہر سے تو لے گئے بادشاہ شیش محل میں کام ہو رہا ہے' کچھ لڑکیاں بھی پینٹنگ کر رہی ہیں۔ بڑے میاں نقش نکال رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم بادشاہی مسجد میں گئے۔ نماز کا وقت تھا' اذان کی آواز گونج رہی تھی حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح جسے سن کر لوگ اپنے رب کے حضور سربسجود ہو گئے۔

ہمارے میزبان میں ایک صاحب کی سسرال جموں میں ہے' ان کا نام ہے اعجاز احمد آذر۔۔۔ میں نے چھیڑا میاں جموں میں سسرال ہے' میری تو بہنیں لاہور میں ہے کرشن نگر چوک فاطمہ! آذر خوش ہو کر بولے لو آپ بہن ہو گئیں۔

واپسی پر بائیں طرف ایک شاہی محلہ بتایا گیا ہے' جہاں طوائفیں رہتی ہیں۔ آذر کہنے لگے میری نظم کی چند لائنیں سنیے۔۔۔ ارشاد

برکت سے پرے ہٹ کے ہوا بازار بنا ہے
افلاس جہاں کوڑیوں کے مول بکا ہے

بیٹھی ہے دریچے میں اک حوا کی بیٹی
تذلیل پہ مجبور ہے تقدیر کی بیٹی

مسجد کے سائے میں یہ خرافات کا منظر
بھرپور طمانچہ ہے یہ تہذیب کے منہ پر

زرداری کے کاندھے پہ افلاس کا توشہ

آ' دیکھ اے اقبال غریبوں کا تماشا!

لاہور کی انارکلی اور دہلی کا چاندنی چوک شاید عاشق و معشوق ہیں' دونوں شاید ایک ہی سانس لیتے ہیں۔۔۔ میں۔۔۔ ستورا اور ڈرائیور انارکلی گئے' بھری بھری انارکلی دیکھ کر سڑک پر لکھا ایک جملہ یاد آیا۔ 'انارکلی عمر کے چلی'۔۔۔ خوب بھری بھری تھی انارکلی۔ وہاں ہم نے کچھ دوپٹے' کچھ جوتے' سرمہ' گرم حلاق کا سامان' اور میں نے اپنی بیٹی کے لیے ایک خوبصورت انگوٹھی خریدی۔ ستورا کی خریداری زیادہ تر اپنی بہو کے لیے تھی۔ بہو اور بیٹی میں آج کل کوئی فرق نہیں!

ایک دکاندار نے لاجواب چاٹ کھلائی۔ ہمارا ڈرائیور بھی ساتھ تھا۔ چاٹ کھاتا ہی۔۔۔ سی' کر رہا تھا۔ میں نے سرینگر میں اپنی بہنوں کے لیے نماز پڑھنے کے لیے دوپٹے خریدے۔ دکاندار کچھ حیران تھا اس کی حیرانگی بڑھانے کے لیے میں نے بڑی عاجزی سے ایک شعر پڑھا۔

در حبیب بھی ہے بیت کدہ بھی کعبہ بھی
یہ دیکھنا ہے سکوں اب کہاں سے ملتا ہے

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔

شام کو ٹاؤن ہال میں سیمینار تھا۔ پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ مجھے بولنے کا موقع ملا تو میں نے کہا میں جب سے یہاں آئی ہوں' یہ پتا نہیں چل رہا کہ میں میکے میں ہوں یا سسرال میں۔۔۔ یہ شہر میرے سسرالیوں کا ہے' محبت اور خاطر داری میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میکے جیسا حق اور اپناپن لیے کئی بھائی بھی میدان میں ہیں۔۔۔ لوگ کافی جذباتی ہو گئے تھے۔۔۔ چائے بھی زوردار تھی۔۔۔

اس رات بہت ہی انوکھا تجربہ ہوا۔۔۔ نہ پہلے دیکھا نہ سنا۔۔۔ لاہور کا گوالمنڈی بازار۔۔۔ آس پاس کھانے کی دکانیں' بیچ میں چوڑی سڑک پر میز کرسیاں باہر ہونے کے قریب تو لوگ ہوں گے ہی' سو کے لگ بھگ تو ہم لوگ ہی تھے۔ ساری دکانوں پر لذیذ کھانوں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ ہماری میز طرح طرح کے گوشت سے بھر گئی تھی۔۔۔ کھائے جاؤ۔۔۔ کھائے جاؤ۔۔۔ گو پیٹ بھی اپنا' بازار کے سرے پر پان والا بھی تھا۔ دکانوں کی چھتوں پر حویلی نما بند کھڑکیوں کی جھریوں سے کیا کوئی جھانک رہا ہوگا؟ کچھ پتا نہ چل پایا۔۔۔ فرنی کی ایک پر دوسری مٹی کی طشتری کو ڈونگی کہا جاتا ہے۔۔۔ دگی کھنکو۔۔۔ نادر فرنی اڑ رہی تھی۔ کھانے کے بعد پان والے کے پاس بھی کئی لوگ گئے۔ ایک نے کہا پان آپ کا مسلہ ہمارا۔۔۔ میں نے کہا پان بھی آپ ہی کے ہیں۔۔۔ ایک طرف اونچے لمبے میراثی لڑکے شاشن ڈھولک پر گا رہے تھے۔ آوازیں آسمان کو چھوتیں' پر قدرے بے سرے۔۔۔ گانا ٹیک پتا کی ختم ہونے میں کم جو ہم نہیں ہے' پر کیا آوازیں تھیں لڑکوں کی۔۔۔ ہائی وے ہائی ے کو جھکا چاہوئے' بیچ میری ڈولو بیچ ہوتے ہوئے لے (ہائی رے ہائی مجھے چھلا پہنا دے' میری ڈولو کھینچ کر اپنے ہوتے میں لگا لو)

وہیں ایک لڑکے نے میری بندی کی طرف اشارہ کر کے کہا کیا یہ
بہت مہنگی ہوتی ہے۔ میں نے کہا نہیں۔۔۔ تمہیں چاہیے کیا؟ وہ شرما کر چلا گیا۔

میں نے سوچا اس نے نصیر کا یہ شعر کہاں سنا ہوگا۔

لڑکے برہمنوں کے ہندوستان میں دیکھے
صندل بھری جبیں ہے ہونٹوں پہ لالیاں ہیں

جانے اب وہ لڑکے کہاں ہیں۔ گوالمنڈی میں ایک لاہورن آپا یوں گلے لگ کر روئیں جیسے سسرال آنے کے وقت کوئی سکھی گلے لگ کر روتی ہے انہوں نے کہا تھا یہ دونوں ملک ہماری زندگی میں ہی مل جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ یہ دکھ ایک بہن بیٹی کا تھا۔۔۔ اور ایک ماں کا بھی۔۔۔ جس کے کتنے ہی بیٹے اس مارا ماری میں چلے گئے۔ یہ کون بتائے کہ ماں صرف ماں ہوتی ہے وہ پاکستان اور ہندوستان نہیں ہوتی۔۔۔ ماں جیسے پیار کا موسم ہے جو دونوں ملکوں پر یکساں طاری ہوتا ہے پر ماں کی کون سنتا ہے۔۔۔ گوالمنڈی میں کھانے تو ہر طرح کے ہیں پر مجے کے پائے کا کیا کہنے۔ مجے کا نام تو فضل حق ہے پر یہاں وہ صرف مجا ہے۔ لاہور میں روز ہی کھانا ہوتا رہا۔ ایک دن دوپہر کا کھانا "وِلیج ریستوران" میں تھا۔ اندر جاتے ہی لگا جیسے کسی دوسری دکان میں آ گئے ہیں۔ بڑی آؤ بھگت سے طرح طرح کے کھانے۔۔۔ میں نے ایک دو چیزیں لیں اور مکئی کی روٹی کو توڑنے لگی۔ ساتھ میں بیٹھی ایک لڑکی فس فس کر قربان ہوئی جاتی تھی۔ معتبر صحافی کے علاوہ بھی کچھ تھی۔ بڑی پیاری سی شخصیت۔۔۔ ساڑی پہنی تھی۔ ویسے پاکستان میں کئی عورتیں ساڑی پہنتی ہیں۔ اس نے ٹاؤن ہال میں مجھے سنا تھا۔ کہنے لگی بتایئے ڈوگری کیسی ہوتی ہے؟ میں نے کہا بالکل میری جیسی۔۔۔ جیسی ماں ویسی بیٹی! اس کے اصرار پر میں نے اسے ڈوگری کی ایک ماہیا سنائی۔۔۔ پہلے کلاڑی کے معنی سمجھائے۔ وہ دھیان سے سن رہی تھی۔۔۔ ہمارے یہاں گوجروں کے گھر جب پہاڑ پر بستے ہیں تو دودھ دہی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دودھ دہی کو ابال کر پانی مویشیوں کو پلا دیا جاتا ہے اور بچے ہوئے پنیر کے گول گول آٹے کے پیڑے جیسے بنا کر سکھا لیے جاتے ہیں پھر کوئی نیچے سامان لینے جاتا ہے تو انہیں بیچ بھی آتا ہے۔۔۔ انہیں 'کلاڑیاں' کہتے ہیں۔ ڈوگرے کلاڑیوں کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ انہیں دیسی آنچ پر توے پر رکھ کر بھونتے ہیں۔ ان میں سے گھی بھی نکلتا ہے اور پھر سینکی ہوئی کلاڑی پر نمک چھڑک کر کون کھائے اور کون چھوڑے؟ خیر یہ تو ہوا تعارف اب سنو ماہیا۔

آؤں کھائی اے شوالک پہاڑیاں
مہالا دیا خت تی لاڑیاں
ان دیتے چڑ بنی گجری کوئی
گوجر تے تلاری کلاڑیاں

(میں اپنے شوالک پہاڑوں پر قربان جاؤں یہ ہمالیہ کی خت تی مچائیں ہیں ان کی تہوں میں بیٹھ کر کوئی گجری اپنے گوجر کے لیے کلاڑیاں تل رہی ہے)

وہ لڑکی دوسرے دن جب کھانے پر ملی تو کہنے لگی۔ آپا! آپ کی ماہیا میری روح میں ہے اور اب تک آدھے لاہور کے دل میں ہے۔ اس کی میز پر کوئی کبوتر بیٹھا تھا یا بچپن میں گھر کی منڈیر پر کبوتروں کا جوڑا دکھائی دیتا تھا اور بچپن جانے ان کبوتروں کو دیکھ دیکھ کر ہم جوان ہوئے ہیں۔ ہم دونوں بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا اٹھیں۔

رات کے کھانوں میں ایک مزیدار بات تھی۔ ایک وائلن نواز ہر محفل کے پاس جا کر وائلن بجاتا۔ وائلن پر اکثر تانا گنگنا کر گیت بجتے۔ لوگ اپنے ماضی کے نغموں میں کھو جاتے۔ دیوی کے گیت جیسے ماضی کی کتاب کے پھڑکتے ورق۔

۔ بڑے ارمان سے رکھا ہے صنم تیری قسم
پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم
۔ میرا لال دوپٹہ ململ کا
۔ آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم
۔ ساون کا مہینہ پون کرے شور

لوگ جھومتے رہے۔ ایک نے وائلن نواز سے کہا۔۔۔ یار کچھ اپنا بھی سناؤ نہیں' کچھ اپنا بجاؤ۔ وائلن نواز نے بجایا۔

۔ چاندنی راتیں سب جگ سوئے ہم جاگیں تاروں سے کریں
باتیں چاندنی راتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں مسکرائی کیا یہ گیت ان کا ہے۔۔۔؟ یہ تو ہم سب کا ہے۔ جیسے ہوا کو کوئی نہیں بانٹ سکا ویسے ہی گیتوں کو کوئی نہیں بانٹ سکا۔۔۔!

جس دن ہمیں اسلام آباد جانا تھا اس دن صبح پانچ بجے کمرے کے پردے کھولے تو شیشے کے ساتھ پر سونے جیسا چاند دکھائی دیا جیسے تھالی ہو۔ میں نے سوچا آج شعر و شاعری سے ہٹ کر دیکھ لیا۔ گھر میں میرے چچا میرے شعر کی پر ضرور عمل پیرا ہو جائیں گے۔۔۔ سات بجے کا جہاز تھا۔ میں نے دیکھا جہاز کی کھڑکی سیٹ سے دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ پر پھر گرا چلا پھر اپنے خول میں سما گیا۔۔۔ اسلام آباد پہنچنے پر ہوائی اڈے سے شہر کا راستہ بے حد خوبصورت ہے۔ سندر راستے میں فاطمہ جناح پارک، جناح یونیورسٹی، پاک سیکرٹریٹ اور درخت جن میں چیڑ کے درخت بھی تھے اور تالی کے بھی۔۔۔ پنجابی کا ایک گیت ہے۔

تالی دے او تھلے بہہ کے لمے کے ماہیا
آ کریے دل دیاں گلاں

(تالی کے پیڑ کی اوٹ میں بیٹھ کر میرے ساجن آ دل کی باتیں
کریں)

اسلام آباد میں اردو کی بین الاقوامی کانفرنس کی وجہ سے جگہ کی تنگی تھی سارے ہوٹل بھرے ہوئے تھے۔ احمد فراز نے کچھ لوگوں کو پوسٹ آفس کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا رکھا تھا جس کی منڈیروں پر چیڑ کے درخت جھکے ہوئے تھے، ان پر بلبلیں نغمہ سرا تھیں---- میں بھی بیٹھی تھی----

شام ہونے میں کافی وقت تھا---- میں نے سوچا پنڈی دیکھ لوں کہا جاتا ہے گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے کہا---- سڑک ختم ہوتے ہی دائیں مڑیں---- سامنے پی سی او ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے لاہور میں منصورہ کو فون کیا تو لگ گیا، مگر ہندوستان میں کوئی فون نہیں لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں باہر جھانکا---- قدرے دھندلکا ہو رہا تھا میں نے سوچا شام ہونے سے پہلے یہاں سے نکل دینا چاہیے۔ مجھے تو جلدی تھی ہی، شاید شام کو بھی جلدی تھی۔ جب میں موڑ کے بعد گلی میں پہنچی تو وہ گلی نہ تھی۔ میں نے سوچا پچھلی گلی سے نکل لیتی ہوں۔ سڑک پر چل رہی تھی۔ گیسٹ ہاؤس کہیں سے بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب میں بڑی سڑک پر پہنچ کر چلنے لگی۔ گیسٹ ہاؤس نہ ادھر نہ ادھر---- پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ یاد آیا ماں کہتی تھیں تیری بدھی میں ڈھنگ نہیں ہے---- میں نے نوٹ کی کو بھی یاد نہیں کیا---- بس گھر ڈھونڈے جا رہی تھی میں نے دیکھا سب میری بندی کو دیکھ رہے ہیں۔ چال ڈھال بھی ہندوستانی تھی---- میں نے بندی اتار کر ہتھیلی پر چپکا لی۔ بڑا انتشار تھا۔ بھگوان کے کرم سے اچانک یاد آیا کہ ڈاک گھر کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوں۔ جس چوکیدار سے پوچھوں وہ کہے کہیں پتا نہیں---- گھبرا گئی تھی۔ دیکھا کہ ایک بڑا مہذب سا جوڑا سیر کرنے نکلا ہے---- میں نے نہایت عاجزی سے کہا میں ہندوستان سے آئی ہوں، پوسٹ آفس کے ڈاک بنگلے میں ٹھہری ہوں، اپنے میاں کو فون کرنے گئی تھی اب گیسٹ ہاؤس نہیں مل رہا۔ وہ لوگ بولے چلیے ہم آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔ وہ صاحب پوسٹ آفس میں ملازمت کر چکے تھے۔ دونوں جب چھوڑنے آئے تو گیسٹ ہاؤس کے گیٹ پر سب کھڑے تھے۔ میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور جان بچی سو لاکھوں پائے کے انداز میں بولی میں واقعی ڈر گئی تھی---- اب جی دیکھو قصہ سنا سکتی ہوں مگر یقین جانیے آج بھی یاد کر کے ڈر لگتا ہے----

اسی شام فراز بھائی نے ایک ہوٹل میں دعوت دی تھی۔ اگلے روز صبح ہم ٹیکسلا کا میوزیم دیکھنے جانے والے تھے۔ اس میوزیم کے کیا کہنے! پاکستان نے ہر چیز بہت حفاظت سے رکھی ہوئی ہے۔ وہاں اسکولوں کی لڑکیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ میری بندی اور ساڑی دیکھ کر سب نے میرے ساتھ فوٹو کھنچوایا۔ اگلے دن ٹیکسلا کا عجائب گھر دیکھنے ہم جا رہے تھے۔ ڈرائیور وقار خان کی گاڑی فراٹے بھرتی، پر تولتی، خوبصورت سڑک پر ایک طرحدار عورت کی طرح بھاگ رہی تھی---- کہیں کہیں پہاڑیاں دکھائی دیتیں ان پر کوئی درگاہ یا عبادت گھر---- ٹیکسلا میں پاکستان سرکار نے بدھ کے زمانے کی کھدائی میں نکلی اشیا کو بڑے قرینے اور احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہے۔ کئی لوگ اور اسکول کے بچے وہاں موجود تھے۔ ٹیکسلا میوزیم دیکھنا ماضی کے کنوئیں میں ڈوب کر آنے جیسا ہے۔

شام کو اسلام آباد کے ایک بازار میں تھالی میں تلی بڑی بڑی جلیبیاں بک رہی تھیں۔ ہم سب نے گرما گرم جلیبیاں کھائیں اور بازار میں خشک میووں کی دکانوں سے خریداری کی۔

اردو کی بین الاقوامی کانفرنس میں پوری دنیا کے نمائندے شامل تھے۔ جب فرانس، چین، جاپان اور دوسرے کئی ملکوں کے لوگوں نے اردو میں تقریریں کیں تو مزہ آ گیا---- جاپان کے ایک مقرر نے کہا لوگ پوچھتے ہیں، جاپان کی ترقی کا راز کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ ہم اپنی زبان میں پڑھتے لکھتے ہیں---- کتنی اچھی بات ہے پر لوگوں کی سمجھ میں کب آئے گی----؟

ہمارے رانگ صاحب نے اردو میں تقریر کر کے سماں باندھ دیا۔ ان کی عظمت و ذہانت یہاں ہر روز چار چاند لگاتی رہی۔ میں اکبر کا یہ مصرعہ بار بار یاد کرتی رہی:

آنکھیں میری باقی ان کا

آپ کو حق ہے کہ کہئے میر کو گنگا ہے غالب کو داد دیجیے مگر مائیں کیا کہہ رہی ہیں اس پر بھی دھیان دیجیے۔ ہم جوانی میں اپنے بچے گنوا کر بہت دکھی ہیں اب ہم بچے پیدا نہیں کریں گے۔

۱۹۴۷ء میں جو عورت لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اپنے نو بچوں کو لے کر دلی آئی تھی وہ میری ساس تھیں۔ میرے سسر یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ لاہور میں ان کا رہنا ممکن نہ ہوگا۔ بعد میں وہ بھی آ گئے تھے۔ دلی میں رہ کر بھی وہ لاہور جاتے رہے۔ اگر آج بھی تیرا میرا---- ہمارا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو---- دونوں ملکوں کے عوام تو یہی چاہتے ہیں---- عوام کی آواز کو دبانا مشکل ہے۔

ہمارا سب کچھ تو سانجھا ہے۔ کیا امیر جاہ پر تم آپ کی نہیں ہیں یا فیض احمد فیض ہمارے نہیں ہیں---- میر، مومن و غالب کس کے حصے میں آئے پتہ نہیں---- اور اقبال وہ تو اپنے فلسفے کو لے کر آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمارے قومی کوی 'دنکر' اقبال کی ہندی میں چھپی شاعری کی کتاب میری کتابوں میں سے چن کر بولے "ہم لے جا رہے ہیں" اور وہ لے گئے۔ مگر اقبال کا اثر دل سے کون لے سکتا ہے---- بڑے میاں! آج بھی آپ کا یہ شعر اتنا ہی سچ ہے جتنا اس وقت تھا جب آپ کی قلم سے نکلا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

بلبلاؤ میرے آنچل میں سما جاؤ یا مجھے اپنی ڈار میں شامل کر لو کہ اب وقت کم اور خواہشات بے انت ہیں----!

☆

پتھر کی میلی آنکھ

غلب عرفانی

خوش حال خان خٹک کے ہم وطن شاعر رب نواز مائل جن کا پہلا مجموعۂ کلام "پتھر کی میلی آنکھ" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے (جو اگرچہ ان کی شاعری کی مناسبت سے قدرے دیر سے شائع ہوا ہے) ایک ایسے فطری اور حقیقی شاعر کا منظر نامہ ہے جس میں تخلیقی عمل کی لاشعوری کیفیت جگہ جگہ اس طرح جلوہ فرما ہے جیسے تاریک شب میں کسی درخت پر جگنوؤں کا جھرمٹ فانوس کی شکل میں جگمگا جاتا ہے۔ بات آگے بڑھانے سے قبل میں اس کتاب میں شائع پہلے شعر کو یہاں تحریر کرنا چاہوں گا جس میں اگر ایک طرف ان کی شاعری کا تعارف جھلکتا ہے تو دوسری جانب ان کے شعر کہنے کا ڈھنگ بغیر تصنع کے اور ان کی طرز باریک بینی میں زندگی کے رویے کا عکس سادگی کے ساتھ موجود ہے:

ہو نہ کوشش سے بھی جب یہ صاف کچھ
زندگی پتھر کی میلی آنکھ ہے

زندگی کو پتھر کی میلی آنکھ کی تشبیہ دینے والا یہ شاعر دراصل اپنی بات کو سادگی لیکن پُرکاری سے کہنے کا ڈھنگ جانتا ہے تب ہی اپنے زاویۂ فکر سے بڑھ کر شاعری کے مبالغے پر زیادہ انحصار نہیں کرتا۔ اسے اپنے قدموں کی فطری پیش رفت اور اپنے من کی لَو ہی پر زیادہ بھروسا ہے۔ یہ یقین کے ساتھ کبھی اپنی دونوں سرمایہ ہائے حیات کی طرح سے اپنے محبوب کے خوابوں تک پہنچ جاتا ہے تو کبھی آنکھوں کی قیادت میں اپنی ہی کہانی کے دوسرے سرے تک جا پہنچتا ہے۔ خود اعتمادی کی یہ فضا ہی دراصل کسی بھی شاعر (اور شخص) کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ اور انعام خداوندی سے کم نہیں ہوتی ورنہ وہ اپنے شعری سفر میں ایسے منفرد اشعار سے کیسے ملاقات کرپاتا:

جس قدر بھی اُن کے ہوئے ہم
اُتنے ہی اپنے بھی تو ملے ہم

جہاں بھی فن سے یہ ٹھہرا کہاں میں
وہاں پھر آپ تھا اپنا جہاں میں

رب نواز مائل ہمارے عہد کے اُن شاعروں میں سے ہیں جو صرف اپنی سیاہی میں چھپے حروف کے سہارے ایک ادبی جریدے سے دوسرے ادبی جریدے تک اپنی شناخت رکھتے ہیں اور بلا مبالغہ اس میں اُن کی کسی پی آر (public relationing) مہم کا کوئی دخل نہیں ہے۔ میں خود بھی اُن کو ذاتی طور پر اب تک نہیں جانتا ہوں بلکہ اُن کی شاعری کو ہمیشہ کسی نہ کسی ادبی جریدے میں پڑھتا اور اس پر سر دھنتا چلا آرہا ہوں۔ مطالعے کے دوران میں نے اکثر اُن کی غزلیہ شاعری کی گہرائی اور گیرائی کو دل سے محسوس کیا ہے مگر جدید جدید کسی شاعر کی شاعری کو وقفے وقفے سے پڑھنا اور بات ہے اور ایک ساتھ کسی مجموعۂ کلام میں (جیسے اس وقت میرے سامنے "پتھر کی میلی آنکھ" کے صفحات پر اپنے تمام درو بست کے ساتھ) محسوس کرنا اور بات ہے۔ جب ایک اچھا اور خوبصورت غزلوں سے مرصع کوئی مجموعۂ کلام کسی شاعر سے مخاطب ہوتا ہے (یاد رہے میں خود بھی اسی دشت کی سیاحی میں گذشتہ ۴۸ سال سے عمر گذار رہا ہوں) تو بات کچھ اور ہی بن جاتی ہے۔ اُن کی شاعری کے مطالعے کے بعد سب سے پہلی بات یہ منکشف ہوتی ہے کہ بے ساختہ پن اپنی لاشعوری کیفیت کے ساتھ موضوع کو پرت در پرت قاری پر کھولتا چلا جاتا ہے۔ یہاں صرف اُن کے ایک شعر کے ذریعے اپنی اس بات کو بطور دلیل پیش کر رہا ہوں:

بہت دیکھ کر بھی نہ جب اُس کو دیکھوں
یہ میں نے ہی گڑیا نہ خود ہیں رکھی ہو

بات دیکھنے کی ہو تو پھر مشاہدے کی گہری حیثیت سامنے آجاتی ہے اور جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ تحت الشعور سے لاشعور تک کے سفر کا منظر بن جاتا ہے اور مائل کے یہاں دیکھنے کا یہ عمل بیشتر اوقات شدت کے ساتھ جاگزیں ہے کہ بیشتر اشعار میں اُن کی چشم مشاہدہ اور اس کی باریک بینی ساتھ ساتھ اُن دو تتلیوں کی مانند دکھائی دیتی ہے جو ایک ہی سمت کو فضا میں اُڑ رہی ہوں۔ یہ دیکھئے اُن کے کچھ ایسے اشعار جن کی معنی آفرینی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے:

وہی وحشی سا وحشی ہے بڑا
یہ اب جو دیکھتا ہوں آدمی کو

جو آنکھ اپنی پھر وہ سماں لائی آگے
کہاں کی کہانی کہاں پائی آگیا

دیکھنا جو بھی ورائے ذات ہے
کوشش و خواہش کی کب یہ بات ہے

ورائے ذات دیکھنا آسان کام نہیں یہ تو معلوم سے لامعلوم تک کے سفر کا ایک پڑاؤ ہے جو صرف اُن لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن کی تخلیقی صلاحیت کو قدرت نے ذہنی استغراق سے نوازا ہے۔ جناب رب نواز مائل بھی جب ایسے کٹھن مگر حیرت سے بھرپور مرحلے میں داخل ہوتے ہیں تو پھر وہ ایسی ماورائی حقیقتوں کا ادراک بھی کر لیتے ہیں جہاں تک جانے کے لئے صرف بے خودی یا لاشعوری کیفیت ہی ساتھ دے سکتی ہے اور ایسی حالت میں شاعر اگر خود کو پاگل سمجھتا ہے تو کیا عجب ہے؟

جدھر سارے ہی لوگ اب جا رہے ہیں
اُسی جانب تو وہ پاگل چلا تھا

یا پھر ایک ایسا بے خبری کا عالم جہاں جانے کے لئے قدم خود بخود بے اختیاری طور پر اٹھتے چلے جاتے ہیں:

وہاں تک جا کے ہو گیا بے خبر کیا؟
یہ کوشش بھی ہے تو آگے جائیں!

تخلیقی عمل کا کوئی کلیہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک انتہائی پر اسرار اور پیچیدہ عمل ہے جو مختلف تخلیق کاروں پر بالخصوص شاعروں پر مختلف انداز سے جلوہ گر ہوتا ہے اور پھر بہت ہی متنوع کیفیات کے ساتھ بار بار تخلیقی عمل سے گزرنے کے باوصف کسی حد تک کوئی شاعر اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ شاعری کو اس مخصوص صنف میں کاوشِ کثرت کا حوالہ بن کر اس کی فطری خصوصیت حاصل کر لیتا ہے لہٰذا اگر میں یہاں یہ کہوں کہ ب نواز ناآل گیسوئے غزل سنوارنے میں خود اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ اظہار ذات کے لئے غزل ہی ان کی شخصیت کا حوالہ بن گئی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ناآل کی شاعری یہ صرف اظہار ذات کے ارفع اظہار کی جانب اشارہ کرتی ہے بلکہ اس کے کئی رخ کا انکشاف بھی کرتی ہے۔ فن کا سلیقہ شعور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ادب کے قاری کو چند حیرت کدوں سے بھی متعارف کرواتا ہے۔ دیکھئے ان کے اس شعری سفر کی آخری آپ سے کیا کہتی نظر آتی ہے:

لہو ٹھہرے ستارے ہست جب ہم کو
لہو سے یوں بھی روشن تر جہاں ہو

لہو کو ستارے سی جانے والا یہ شاعر خود غزل کے بارے میں کیا کہتا ہے آیئے دیکھتے ہیں:

"دراصل میں اگر غزل کی جملہ خوش صورتی اور جملہ مضامین و امور سے متعلق صرف ایک بات کروں اور اسے صرف ایک شے سے تمام تر شکوں کو گنواؤں تو وہ اس کی "موسیقیانہ نوعیت" ہے چنانچہ اس طور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہی وہ گود ہے جہاں سے غزل کو سب کچھ ملتا ہے۔ مضامین کے طور کیا سوچنے کو بھی اور کہنے کو بھی۔ یہ اس طرح اس کا خاص امتیاز ہے کہ شاعری کی اور اصناف میں نظم، رباعی، قطع وغیرہ سب میں مضمون پہلے سوچا جاتا ہے اور موسیقانہ نغمگیا اثر بعد میں دیا جاتا ہے لیکن غزل میں جیسے مضمون ہی اس کی موسیقیانہ نوعیت سے پیدا ہوتا ہے بہ الفاظ دیگر یعنی جو خیال اس میں منظوم ہوتا ہے لوہے کے موم ہونے کے مصداق برائے استعمال یا تو موجا اگر م ہوتا ہے یا دیگر حقائق سے جو ساتھ آتے ہیں اسے نرم کر دیا جاتا ہے۔"

خود اپنے الفاظ میں لوہے کو موم کرنے کا یہ اعتراف ہی ب نواز ناآل کی غزل کی اساس ہے اور وہ اپنے اسی وسیلے کو ساتھ لے کر ہمارے سامنے اپنی غزل کا مجموعہ چہرے کی سچی آگہی پیش کر رہے ہیں جس سے اردو شاعری کا مستقبل (بالخصوص غزلیہ کلام کا) بہت کچھ توقعات وابستہ رکھتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

بڑی دیر ہو گئی

نارنگ ساقی

"بڑی دیر ہو گئی" میرے عزیز پاکستانی دوست اظہر جاوید کی ان پچیس کہانیوں کا مجموعہ ہے جو پنجابی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ کتاب کی طباعت نہایت خوبصورت ہے اس کا دیدہ زیب سرورق بر اعظم کی مشہور آرٹسٹ سلیمہ ہاشمی نے بنایا ہے جس نے کتاب کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیا ہے۔ اظہر جاوید کے بارے میں یہ تو آپ کو جانتے ہی ہیں کہ پاکستان کے مشہور معروف اور مستند اردو ادبی ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر ہیں۔ وہ بہترین نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں۔ اردو میں ان کی شاعری کا مجموعہ "موسم عشق گزرتا ہوا" 2003ء میں شائع ہوا جسے ادبی حلقوں میں اتنا سراہا گیا کہ تین مہینوں کے اندر ہی اس کا پہلا ایڈیشن فروخت ہو گیا۔ یہاں مجھے مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا ایک قصہ یاد آ رہا ہے غالب اکیڈمی دہلی میں شاعری کی ایک کتاب کا اجرا کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین نے فرمایا تھا "اس کتاب کی مقبولیت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ چھپاتے ہی اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آ گیا ہے اس موقع پر خصوصی رعایت کا اعلان بھی کیا گیا ہے دوسرے ایڈیشن کی ایک جلد خریدنے والے کو اس کے پہلے ایڈیشن کی دو جلدیں مفت دی جائیں گی۔" اظہر جاوید کے لئے شعر و ادب نہ صرف اوڑھنا بچھونا ہے بلکہ سانس لینا اور آہیں بھرنا بھی ہے۔ وہ چھتیس برسوں سے لاہور سے "تخلیق" کو بڑی پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔ اظہر جاوید نے اپنا زیادہ تر تخلیقی کام اردو زبان میں ہی کیا ہے لیکن پنجابی چونکہ ان کی مادری زبان ہے اس لئے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے پنجابی زبان میں ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن کی بنیاد عشق و محبت کے اس لازوال جذبہ پر رکھی گئی ہے جس سے ہر آدمی اپنے اپنے انداز اور اپنی اپنی بساط کے مطابق گزرتا ہے آدمی جب بھی سچ بولنا چاہتا ہے تو سچ بولنے کے لئے اپنی مادری زبان کا ہی انتخاب کرتا ہے۔ یہی نہیں جو گالی مادری زبان میں دی جاتی ہے وہ کسی اور زبان میں دی جانے والی گالی کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور موثر سمجھی جاتی ہے۔ اس پر ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ ایک ہندوستانی افسر کے ماتحت پانچ سات انگریز ملازمت بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ اسے ایک انگریز ملازم کو ڈانٹنے کا موقع میسر آ گیا۔ پہلے تو اس نے اسے انگریزی میں "سلی ایڈیٹ' باسٹرڈ بلڈی فول وغیرہ گالیوں سے نوازا اس کے بعد اسے خالص پنجابی زبان میں گالیاں نکالنے لگا۔ تیری ماں کی.... وغیرہ وغیرہ۔ اس پر ساتھ بیٹھے ایشیائی افسر نے سوال کیا کہ آپ نے پہلے اسے انگریزی میں ذلیل کیا تھا تو پھر پنجابی میں گالیاں دینے کا کیا فائدہ جو اس کی سمجھ میں بھی نہیں آئی ہوں گی تو اس نے جواب دیا "اسے سمجھ آئی ہوں یا نہ آئی ہوں میری تسلی تو ہو گئی۔" اگرچہ اظہر جاوید نے کتاب کے دیباچہ میں اعتراف کیا ہے کہ ریڈیو کے اسلام شاہ اور شفقت تنویر مرزا کی حوصلہ افزائی کے نتیجہ میں انہوں نے ابتداء میں پنجابی میں کہانیاں لکھیں۔ پھر لوگ ان کی کہانیوں کو پسند کرتے گئے اور وہ پنجابی کے افسانہ نگار بنتے چلے گئے۔ کتاب کا نام "بڑی دیر ہو گئی" بھی بڑا معنی خیز ہے۔ اس عنوان کو پڑھ کر مجھے منیر نیازی کی ایک نظم یاد آ گئی جس کے ہر بند کے بعد ایک مصرعہ چلا آتا ہے

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

منیر نیازی نے اس نظم میں بڑی صراحت کے ساتھ ہمیشہ دیر کر دینے کے معقول وجوہات اور جائز جواز دونوں کو ایک ساتھ پیش کر دیا ہے

اظہر جاوید کو میں پچھلے تیس برسوں سے جانتا ہوں۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب اظہر جاوید ہمارے بڑے بھائی قتیل شفائی کے عقیدت مند اور نوجوان دوست کی حیثیت سے ہندوستان آیا کرتے تھے۔ اظہر جاوید جب بھی ہندوستان آتے ہیں (جو وہ اکثر آتے رہتے ہیں) تو ان کا زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزرتا ہے کیوں کہ میرا دفتر ہی ان کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا ہے۔ ان سے ملنے کے خواہش مند حضرات اکثر یہیں آتے ہیں۔ ان تیس برسوں میں ان سے میرے نہایت گہرے مراسم استوار ہوئے اور میں رفتہ رفتہ ان کی عادتوں' ان کے نقطہ نظر' ان کے طرز عمل اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں کسی حد تک ان کے معاملات دل سے بھی واقف ہوتا چلا گیا۔ اس عرصہ میں تین چار مرتبہ مجھے بھی لاہور جانے اور ان کے قریبی احباب سے ملنے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ آج کی تیز رفتار زندگی میں کسی بھی دوست کو بخوبی جاننے کے لیے تیس برس کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اب جو میں نے اظہر جاوید کی پنجابی کتاب "بڑی دیر ہو گئی" پڑھی تو سمجھ میں آیا کہ انہوں نے یہ کتاب صیغہ واحد متکلم میں کیوں لکھی ہے۔ اس لیے مجھے تو یہ کتاب اظہر جاوید کی آپ بیتی یا عشق بیتی نظر آتی ہے۔ ان افسانوں میں جا بجا جو کردار آتے ہیں' چاہے وہ پاکستانی ہوں یا ہندوستانی' میرے جانے بوجھے سے

لگے۔ نہ صرف واقعات بلکہ کرداروں کے نام بھی مجھے اصلی نظر آئے۔ یہ کہنا تو بے جا نہ ہوگا کہ بعض کرداروں سے میری شخصی شناسائی بھی رہی ہے اس لیے میں اس کتاب سے بے حد لطف اندوز بھی ہوا۔ سچ پوچھئے یہ مجموعہ خود نوشت سوانح حیات معاشقہ کی ایک جھلک بن گیا ہے۔ انہی دنوں اظہر جاوید کی تازہ ترین نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا جو بذات خود میری اس بات کی تصدیق ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

جب سے میرا مجموعہ چھپ کر آیا ہے
اس نے ایسی الجھن میں الجھایا ہے
جن کے لیے یہ نظمیں غزلیں لکھی تھیں
ان سب نے اک خاموشی سی تانی ہے
جانے دل میں کیا ٹھانی ہے
ان کے بعد میں آنے والی ہر لڑکی
مجھ سے پوچھتی رہتی ہے
کون ہیں، کتنی موہنی، چہرا
ہر اک شعر میں، ہر مصرعے میں
صاف نظر آتے ہیں ان کے پیار کا پھندا
میں ان کو سمجھاتا ہوں
جھوٹی باتوں سے ان کو بہلاتا ہوں
یہ تو عام ہیں ناموں کی تصویریں ہیں
الٹے سیدھے سپنوں کی تعبیریں ہیں
یہ تو تمہارے نام کے سب لشکارے ہیں
گپ چپ سے یہ اشارے ہیں
ورنہ میری نظمیں غزلیں
میرے شعروں کی یہ حقیقت
تم ہی سے تکمیل ہوئی ہے
عشق کی یوں تکمیل ہوئی ہے

اظہر جاوید سے دوستی اتنی پرانی ہو گئی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے رازدان بننے کا پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اس وسیلے سے بھی میں ان کہانیوں کی نزاکتوں اور واقعات کے نشیب و فراز سے واقف ہوں۔ اظہر جاوید کا کمال یہ ہے کہ وہ سچے واقعات کو بھی چابکدستی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ان کی افسانہ طرازی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کہانیوں میں بیان کردہ قلبی وارداتیں وہ ہیں جن سے اظہر جاوید خود گزرے ہیں لیکن انداز بیان اور طرز ادا کی خوبی نے ان کی کہانیوں میں وہ خوبصورتی پیدا کی ہے کہ یہ کہانیاں پنجابی زبان و ادب کا قیمتی اثاثہ بن گئی ہیں۔ میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ کہانیاں ایک اعتبار سے اظہر جاوید کی ”حیات معاشقہ“ کی مختلف جھلکیاں ہیں۔ اور ان میں ہماری ملاقات اس افسانہ نگار اظہر جاوید سے ہوتی ہے جو نازک اور لطیف احساسات کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کرنے کا گر جانتا ہے۔

جن لوگوں نے جوش ملیح آبادی کی ”یادوں کی برات“ پڑھی ہے انہیں یہ پتہ ہوگا کہ جوش ملیح آبادی اپنے معاملات دل کو پیش کرنے کی خاطر زیب داستان کے طور پر اپنے عشق کی تفصیلات کو کچھ اس طرح اور ایسے فخریہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ عاشق یعنی خود جوش ملیح آبادی ایک مافوق الفطرت کردار بن کر ابھرتے ہیں۔ لگتا ہے اس زیب داستان میں داستان کم اور زیب بڑا ہو گیا ہے۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ایسا کرتے ہوئے جوش صاحب عشق کے میدان میں نہیں بلکہ کشتیوں کے دنگل میں موجود ہیں۔ اور کشتی کے ہر مقابلے میں جیت جوش ملیح آبادی کی ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عشق کے ایسے مصنوعی قصے کسی تجربہ کار جواں رعنا کے نہیں بلکہ نابالغ بچوں کے خام تخیل کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں عشق کے وہ نازک اور لطیف لمحات نظر نہیں آتے جو اپنی رنگینی اور بوقلمونی کے ذریعہ کو ایک اعلیٰ اور ارفع رتبہ عطا کر دیتے ہیں۔ اظہر جاوید کا کمال یہ ہے کہ وہ جب عشق کرتا ہے تو ایک بھرپور اور ذمہ دار انسان کی طرح پیار و عمل ظاہر کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ محرومیاں اور سرخروئی یا رسوائی کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس لیے اظہر جاوید کی ہر کہانی کا ہیرو (جو خود اظہر جاوید ہے) اپنے طرز عمل کے ذریعہ اپنے پڑھنے والوں کو عشق کا کوئی نہ کوئی نیا نکتہ، نیا احساس، نیا جذبہ، نیا سوز اور نئی نظر عطا کر جاتا ہے۔ یہی ان کہانیوں کی خوبصورتی ہے اور ان کی انفرادیت بھی کہ انہیں پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ آپ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے جیسے آپ خود کہانی کی اس واردات قلبی سے قدم قدم گزر رہے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اتنی خوبصورت کہانیاں لکھنے والے اظہر جاوید نے اپنے آپ کو صرف پنجابی زبان تک کیوں محدود کر رکھا ہے اور اس معاملہ میں اتنی دیر کیوں روا رکھی ہے۔ مانا کہ عشق کے معاملے میں اس نے مصلحتاً دیر کر دی ہے لیکن افسانہ نگاری کے معاملہ میں اتنی دیر جائز نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ ان کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کر دیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اردو میں بھی کہانیاں لکھیں تا کہ قارئین کا حلقہ وسیع ہو اور انہیں یہ پتہ بھی چلے کہ اظہر جاوید کتنا بلند پایہ افسانہ نگار ہے۔

”پینگ ہلارے لیندی“

پروفیسر علی اعظم بخاری

اردو ادب میں جہاں محمد فیروز شاہ نے اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا ہے وہیں وہ سرائیکی کے میدان میں بھی ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان کے بھی چند ماہ پہلے آئے ہوئے ادبی شہکار "عمر شب میں چہ تاں" اور "یا قوو آرزو" کے بعد یہ سرائیکی شاعری کا انتخاب اس شہر کے لئے ایک اور اعزاز ہے جس طرح ان کی نثر میں غنائیت، نادر سلاست، تنوع اور ایک مترنم آہنگ انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز و نمایاں کرتا ہے اسی طرح ان کی شاعری بالخصوص نظم اور غزل اپنی انفرادیت کا سکہ اہل ادب سے منوائے ہوئے ہے... اب "پینگ" کی صورت میں ان کی سرائیکی شاعری تمام سرائیکی شعراء کے لئے ایک معیار اور سنگ میل ہے اور یہ Criteria ضروری بھی تھا کیونکہ سستی شہرت، دولت اور ناموری کے جنون کے مارے سرائیکی شعراء اور گلوکار جس انداز میں ہماری مقدس اور محترم شاعری کا خون کر رہے ہیں انہیں ایک رستہ دکھانا ضروری تھا اور محمد فیروز شاہ نے اس نازک مرحلے میں اس بات کا بیڑا اٹھایا ہے اور "پینگ" کی شاعری کے ذریعے ان لوگوں کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا ہے۔ یہ مبتذل اور سوقیانہ قسم کے شاعر معاشرے کے شریفانہ ماحول میں بدی کا زہر گھول رہے تھے گویا زاغوں نے چمن پر تصرف کر رکھا تھا یا کرگسوں نے شہر کی فضاؤں پر قبضہ جما رکھا تھا.... محمد فیروز شاہ نے وہ کام کیا ہے جو ہمارے صوفی شعراء نے کیا ہے جو بابا فرید، بلھے شاہ اور شاہ حسین نے کیا ہے....

محمد فیروز شاہ نے "پینگ" کی شاعری کے ذریعے صحرا میں اذان دی ہے مسموم فضاؤں کو اس سے معطر اور منور کیا ہے کرگس زادوں کو شاہین صفت بنایا ہے۔ زاغ و زغن کی مکروہ آوازوں کی جگہ پر بلبل ہزار داستان کی زمزمہ پردازیوں کا فیض عام کیا ہے۔

کوئی شاعر اور ادیب جب بھی کسی ثانوی زبان کو اظہار کا وسیلہ بناتا ہے تو یہ کام ایک مصنوعی اور جھوٹے رنگوں کی ریزہ کاری سے زیادہ نہیں ہوتا کیونکہ جب تک شاعر اور ادیب کسی بھی زبان کی ثقافت، تہذیب اور تمدن میں رچا بسا ہو نہیں ہوتا وہ سچ نہیں لکھ سکتا.... اردو یا انگریزی میں شاعری کرنا یا ادب لکھنا بالکل ایسے ہی ہے..... کیونکہ پنجاب اور سرائیکی خطے کے رہنے والے لوگ اردو یا انگریزی کلچر سے بالواسطہ آشنا ہیں۔ کیونکہ کلچر تو ماں بولی کی طرح انسان کی روح میں رچا بسا ہوتا ہے کسی بھی دوسری زبان میں کچھ کہنا خلاف میں معلق ہو جانے کے مترادف ہوتا ہے مجھے اس سے بحث نہیں کہ مادری زبان اور قومی زبان کی کتنی اہمیت اور ضرورت ہے میں زبان کی حد تک اپنی بات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں کسی غیر زبان میں باتیں کرتے کرتے جب کوئی اپنی ماں بولی میں گفتگو کرتا ہے تو یہ ایسے ہے کہ جیسے کوئی جھوٹ بولتے بولتے اچانک سچ بولنے لگا ہو۔ محمد فیروز شاہ نے "پینگ" کی شکل میں سچ کہا ہے اور یہ سچ بھی کتنا خوبصورت ہے۔ کتاب کے ٹائٹل، طباعت، کمپوزنگ سے لے کر شاعری تک یہ سچ لپکتا اور دمکتا نظر آتا ہے

آج کل شہر میں کتاب کے مطالعہ کا قحط بھی ہے اور فقدان بھی..... سب بس کتاب کے ظاہری جمال کو دیکھ کر اس کے اچھا ہونے کا فتویٰ جاری کر دیتے ہیں کتاب کے اندر جھانک کر دیکھنے کی فرصت اور شوق ہی کب ہے؟ وہ زندگی کو دکانداری اور تجارت کی نظر سے دیکھنے والے لوگ ہیں۔ یہ لوگ ہر ساحل صرف ساحل کے نظارہ ہائے دلفریب میں گم لوگ ہیں۔ یہ علم و حلم کی بجائے حجم اور خوبصورت جسم کو، سیرت کی بجائے صورت اور کمال کی بجائے ظاہری حسن و جمال پر مرمٹنے والے ہیں۔ ان میں صلاحیت ہی نہیں کہ وہ دریا میں اتر کر اس کی پہنائیوں اور رعنائیوں کا اندازہ کر سکیں۔ انہیں سیپ دریا میں چھپے ہوئے لعل و جواہر کی کیا خبر..... ؟ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاہ صاحب کی یہ کتاب "پینگ" ہر دو قسم کے لوگوں کے لئے باعث کشش ہے ساحل پر تماشائے حسن و جمال کرنے والوں کے لئے بھی اور دریا میں اتر کر غواصی کرنے والوں کے لئے بھی....!

یہ عجیب بات ہے صاحبان سلوک و معرفت اور صوفی شعراء اسی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو علم اور حلم کا مرجع و منبع ہے محمد فیروز شاہ اور ان کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی اسی مسلک سے ہے۔ وہ خاصان خدا اور صاحبان سرور و حضور تھے۔ میری بات کا ثبوت "پینگ" کا انتساب ہے۔ پھر حمد و نعت اور سلام اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

"پینگ" ہماری سرائیکی ثقافت کی ایک نمایاں علامت ہے بچپن سے لے کر جوانی اور پھر جوانی سے لے کر مرتے دم تک انسان کی زندگی پر "پینگ" ہی طاری ہے۔ یہ "پینگ" مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے کبھی پالنے کی شکل میں کبھی "گھگھوسی" کی شکل میں۔ کبھی قوس و قزح کے رنگوں میں، کبھی ماں کی گود کے روپ میں... کبھی ہوا کے ہلکوروں میں تو کبھی کیف و سرور کے انداز میں پینگ میں جھولنا ہماری سرائیکی ثقافت کا ایک منفرد رنگ ہے۔ عید کے موقعوں پر باغوں میں، سیرگاہوں میں بچے، جوان مرد اور عورتیں جب پینگ لیتے نظر آتے ہیں تو مسرتوں اور خوشیوں کی پریاں آسمانوں سے اترتی نظر آتی ہیں... ہو سکتا ہے کہ آئندہ زمانوں میں انسانی ارتقاء اس پینگ کا نام و نشان مٹا دے مگر محمد فیروز شاہ کی شاعری اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی!

پکے لا دے پینگ اڑیندے

تخلیق عصر ..... تازہ تصانیف کا تعارف ..... عطیہ سکندر علی

تعزیتی خطوط

ڈاکٹر سید معین الرحمن جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم انتہائی رنجور ہے کی پیشہ ورانہ جستجو، لگن اور مہارت کی بابت الفاظ کی کمی تقاضا بھی ایک طرح سے ڈاکٹر صاحب کی مداحی کے لئے ناکافی ہے۔ علم و ہنر کے باب میں بے شمار کار ہائے نمایاں ظہور میں لانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "تعزیتی خطوط" کا گلدستہ ادبی ساون رُتیں کار جناب لیاقت علی رضوی کے تعاون سے منظر عام پر لا کر اردو ادب کے ذخیرہ خطوط میں خوبصورت و دلنشیں اضافہ کیا ہے۔ "خطوں کا یہ مجموعہ" کے عنوان سے ڈاکٹر معین الرحمن صاحب رقمطراز ہیں "خط تو کم و بیش ہر وہ شخص لکھتا ہے جو پرائمری سکول تک پہنچا ہے، جسے لکھنا آتا ہے اور جو کاغذ یا تختی سیاہ کر سکتا ہے لیکن اچھا خط ہر آدم زاد کے بس کی بات نہیں۔ اس کا تعلق اچھے دوستوں کی محبت، اچھی کتابوں کی رفاقت کے علاوہ خود اپنی سرشت اور مزاج سے ہوتا ہے اور مزاج میں ماحول، علم، شعور، تربیت اور افتاد طبع سب کا دخل ہوتا ہے۔"

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں: "اس مجموعے میں شامل متعدد خطا میرے نام ہیں یہ تعزیتی خطا میرے لئے تقویت اور توانائی کا باعث ہوئے اور احساس ہوا کہ دردِ دل کا دوا کبھی مگر حرفِ دعا، درماں ضرور ہے۔ خستگی اور درماندگی کے عالم میں مجھے ان سے سہارا ملا ہے۔ "تعزیتی خطوط" میں شامل خطوط کی تعداد چھ سو کے قریب ہے اور یہ سید راس مسعود سے سید مقصود حسین تک یعنی 1934ء سے 2005ء تک پر مشتمل ہے جو کہ تمام کے تمام قابل اور بلندی کے حامل احباب قلم نے رقم کیے ہیں جید و جید ناموں کے اندراج ہوا الکلیہ یہاں استعمال کرنا کورذوقی کی دلیل تصور کیا جائے گا لہذا ایک سو ساٹھ صفحات کی یہ جلد کتاب اپنے اندر بہت سے زمانوں اور بہت سا موجود کینوس کے سینوں کا بار اٹھائے فقط ایک سو پچاس روپے کے عوض 42۔ دی مال "کلاسیک" پر آپ کے لئے تشنگی راہ تکتے ہوئے ہے۔

چٹکی بھر روشنی

"چٹکی بھر روشنی" ڈاکٹر وزیر آغا کی تازہ نظموں کا مجموعہ ہے جس کی اشاعت کاغذی پیرہن لاہور کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب عمر، تجربہ اور فنی مہارت کے جس مقام پر فائز ہیں اس کے بعد اُن کی ذات، فن اور تحریک پر کوئی قد آور شخص ہی رائے زنی کا اہل ہے البتہ مجھے از خود اس کے طور پر "ساری نظمیں خاک ہوئیں" کے عنوان سے ایک نظم نذر قارئین ہے "اب تو یوں لگتا ہے جیسے ---- موسم سارے وقت پہ آتا ---- وقت پہ جاتا بھول چکے ہیں ---- جب جی چاہا ---- دروازے کے پٹ توڑ کے ---- گھر کے اندر آجاتے ہیں ---- چھت سے ---- کاڑھی کیچڑ کے دھاروں میں ---- بہنے لگتے ہیں ---- ہر شے لت پت ہو جاتی ہے ---- لفظوں کے پھل ---- حرفوں کی قاشوں میں بٹ جاتے ہیں! ---- باہر کیا کرتے ہیں موسم ---- یہ مت پوچھو ---- صبح ہوئی تو پنجل کے اک پیڑ سے میں نے ---- پوچھ لیا کیا حال ہے بھائی، کیسے تو نے رات بتائی! ---- چپ تھا، منہ سے کچھ نہیں بولا ---- میں نے دیکھا ---- پنجل کے قدموں میں اُس کی ---- ساری دولت ---- ملبوس بنی پڑی تھی ---- پیڑ پہ لکھی ساری نظمیں خاک ہوئی تھیں!!" کتاب کی طباعت نفیس کاغذ عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت فقط ایک صد روپیہ اور دستیابی کا پتہ 72۔ بیڈن روڈ لاہور ہے۔

شخصیت

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی جس قدر ہمہ جہت شخصیت اور جس قدر وسعت گری کے حامل ہیں اسی قدر ان کے فکر و فن کا احاطہ ہے تو ناممکن مگر پروفیسر فردوس خان رومی نے اس کو بڑی عمدگی کے ساتھ سر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقلم خود کے عنوان سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر، میرے جیون ساتھی کے عنوان سے بیگم ہرگانوی کی تحریر اور میرے عاشق کی مناسبت سے محترمہ مینا جوگن کی دلچسپ تحریروں کے علاوہ کم و بیش پچاس معروف اہل قلم کی تجاویز کے علاوہ اتنی ہی تعداد میں مستند سخنوروں کی جانب سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے فکر و فن کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تیس سے زائد صفحات نادر و نایاب تصاویر کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں جن کی طباعت کے لئے آرٹ پیپر کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پانچ صفحکی پیش گفتار میں ڈاکٹر فردوس خان رومی نے بڑے موثر انداز میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی شخصیت اور فن کا احاطہ کیا ہے۔ یہاں یہ درج کرنا انتہائی نامناسب ہو گا کہ کتاب بے حد مفید اور کارآمد ہے یقیناً ایسی دستاویز تحقیق و جستجو کرنے والے کے خون جگر کا نچوڑ ہوا کرتی ہیں اور جتنی حوصلہ افزائی کی جائے کم ہے۔ اس کا مناسب و موزوں طریقہ یہ ہے کہ آپ اولین فرصت میں نرالی دنیا پبلی کیشنز 358-A، بازدلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی سے رابطہ کیجئے اور زیر نظر کتاب حاصل کر کے خود بھی استفادہ کیجئے اور احباب کو بھی اس جانب رجوع کیجئے۔

رفتہ رمز

جناب کرشن کمار طور زاردو پٹی سے الگ رہ کر بھی اردو زبان و ادب سے جس قدر سنجیدہ اور پُرخلوص رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں اس کے لئے انہیں داد بھی ملنا چاہئے اور ان کے شعری درد کو محسوس بھی کیا جانا چاہئے۔ "رفتہ رمز" جناب کرشن کمار طور کا ایسا شعری کارنامہ ہے جس میں جابجا انسان اور اس کو درپیش مسائل کا ذکر فنی رچاؤ اور بالیدگی سے کیا گیا ہے

ہر ایک شخص کو اس دہر میں جواب کیا
یہ کیسا سنگ ملا تھا جسے گلاب کیا

کہاں ہے خواہش ارض و سما میرے اندر
تماشا کرتی ہے میری انا میرے اندر

جہان دیدہ میں میرا وجود لامحدود
فضا تو کم ہے نوائے سرود لامحدود

چھپا تھا ذرے میں جو آئینہ نکل آیا
زمیں کی خاک سے کیا جانے کیا نکل آیا

دراصل جناب کرشن کمار طور کی شاعری تلاش ذات کی شاعری ہے۔ برصغیر کے کتنے اہل قلم اور اہل دل اس درد میں مبتلا ہیں کتنوں کو اپنی جستجو میں کامیابی نصیب ہوئی اور کتنے بے نیل مرام ہوئے۔ جو کچھ بھی ہے اور جس قدر بھی ہے، ہے بہت خوب "رفتہ رمز" کے مطالعے کے بعد آپ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں تو "رفتہ رمز" کے شاعر کرشن کمار طور صاحب کو ضرور باخبر کیجئے کہ ابھی اس خاک میں بہت سی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ آخر میں جناب کرشن کمار کا ایک شعر آپ کی نذر ہے

وہ مرحلہ وفا میں جو ایک پل مڑ گئے
ہم اپنے آپ سے کٹ کر کہیں نہیں جڑ گئے

"رفتہ رمز" ایک سو اٹھائیس صفحات پر محیط ہے قیمت دو صد روپیہ انتہائی زیادہ اور دستیابی کے پتے مندرجہ ذیل ہیں:
مکتبہ شب خون رانی منڈی الہ آباد۔
مکتبہ سرسبز E- 134 کھنیارا روڈ دھرم شالہ ہماچل پردیش۔

مہر حرا

اُن کا ذکر اُن کی بات ہوتی ہے
یوں بسر اپنی رات ہوتی ہے

ارفع ہیں بے مثال ہیں یکتا حضور ہیں
لاریب دو جہاں کا اُجالا حضور ہیں

نازاں کو میری خوش کلامی میں رکھا
خدا نے مجھے شادمانی میں رکھا

ذکر حبیب کبریا جذب اثر کی آبرو
مدحت سید الورا علم و ہنر کی آبرو

طالب ہوں میں نہ خلد نہ حور و قصور کا
البتہ چاہتا ہوں تقرب حضور کا

عقیدت میں ڈوبے ہوئے یہ چند اشعار پروفیسر نذیر کجاہی صاحب کے نعتیہ مجموعے "مہر حرا" سے آپ کی نذر کیے گئے ہیں۔ مقصود آپ کی توجہ پروفیسر نذیر کجاہی صاحب کی دردمندی اور شوق کی جانب دلانا ہے۔ کتابیں چھپتی ہیں بٹتی ہیں اور لائبریریوں کی زینت بن جاتی ہیں۔ کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو دلوں پر نقش بن کر اپنا اثر قائم رکھتی ہیں۔ آپ کی جستجو اشتیاق یقیناً "مہر حرا" کے مطالعے کے بعد ایک مثبت تاثر قائم کرے گا اور اسی تاثر کے ردعمل میں پروفیسر نذیر کجاہی صاحب کے حوصلے جواں اور ولولے تازہ ہوں گے جس کا ثمر مزید شعری جوہر اور عقیدت کی روشنی سے بھرپور ہوگا "مہر حرا" کی ضخامت ایک سو تیس صفحات اور قیمت دو صد روپیہ ہے جس کی دستیابی فرہاد بیلی کیشنز کمال آباد 3، راولپنڈی سے ممکن ہے۔

رومی کشمیر

بابا نجابت حسین اوکلی پیشے کے اعتبار سے مدرس رہے ہیں۔ علم و ادب سے ان کا تعلق ایک طرح سے آبائی ورثہ ہے ان کے جد امجد میاں صدر الدین حضرت میاں محمد بخش کے والد گرامی حضرت میاں شمس الدین کے گہرے دوست اور مشرقی علوم و فنون کے عاشق و دلدادہ تھے۔ حضرت میاں محمد بخش سے بابا نجابت حسین کی عقیدت کا ثمر "رومی کشمیر" کی شکل میں عاشقان ادب کے لئے پیش ہے اپنی اس تالیف میں بابا نجابت حسین نے مولانا روم اور حضرت میاں محمد بخش کی طرز فکر میں مطابقت، ہم آہنگی اور ہم خیالی کو یکجا کرنے کی بھرپور سعی کی ہے اصل میں بابا نجابت حسین کا یکا نام میاں محمد بخش کے فکری و فنی مقام سے بے اعتنائی کے ردعمل میں ظہور ہوا ہے کیونکہ بابا نجابت حسین قرآن مجید، حضرت میاں محمد بخش اور علامہ اقبال کے سچے اور پکے عاشق و مجاہد ہیں اور اس گرمی قلب نے اُن سے حضرت میاں محمد بخش کے افکار و اقوال کو عالمی مفکر و مبلغ مولانا روم کے مماثل قرار دیا ہے کہ برصغیر کے لوگوں پر مولانا روم کی تعلیمات، افکار و خیالات کا جس قدر اثر ہے اُس کی روشنی میں ہمارے بزرگوں نے بھی تعلیمات کی اسی کڑی کو اپنے حالات اور اپنے انداز میں آگے بڑھانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ بابا نجابت حسین نے اپنی اس کاوش میں حضرت میاں محمد بخش سے علامہ اقبال کے ذہنی قرب کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ غرض "رومی کشمیر" مولانا روم، حضرت میاں محمد بخش اور علامہ اقبال کے فکر و فن کو یکجائی کے آئینے میں دیکھنے کا بہترین ذریعہ ہے جس کی ضخامت قریب پونے تین سو صفحات اور قیمت دو صد روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ: بکر بلی۔ تحریکی میرپور آزاد کشمیر ہے۔

سفر پارے

"یہاں کے مردوں کے جسم بھی متناسب اور سڈول ہوتے ہیں۔ ایک امریکی اوسطاً دو گھنٹے روزانہ اپنے جسم کو فٹ رکھنے میں صرف کرتا ہے...."

"روڈ کیٹ" رویڈی کی اسی طرح کی ایک شاخ ہے جیسے ہمارے ملک میں ہر سیاسی جماعت نے کالجوں یونیورسٹیوں میں اپنی اپنی بغل بچہ تنظیمیں بنا رکھی ہیں۔۔۔" میرے سب کو دیکھتے لگے مگر گونجھوں کی خریداری کے بارے میں ہم سب کا ردِعمل ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ میں نے یہ دلچسپ بات نوٹ کی کہ اس ردِعمل کا تعلق ہماری مالی حیثیت سے نہیں ازدواجی حیثیت سے تھا۔۔۔"

"آگے والے سب ڈرائیور رانگز کرا جائیں گے اور پوچھیں گے کہ ہارن بجا کر آپ ہمیں بیوقوف ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہاں ڈرائیونگ کرتے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں میں نے چند ہی مرتبہ کسی کو ہارن بجاتے دیکھا ہے۔۔۔"

"لائبریری آف کانگریس دیکھ کر میں نے جیب سے سیاحوں کی رہنمائی والا نقشہ نکالا اور ریلوے سٹیشن جا کر یسٹ پیٹر کھنڈول کے قریب زیرِ زمین ریلوے سٹیشن کا ٹکٹ خرید لیا۔۔۔" اگر آپ کے دل میں اشتیاق ہے، جستجو ہے، لگن اور تڑپ ہے تو ڈاکٹر احمد نصیر کے دلچسپ سفرنامے "سفر پارے" کا مطالعہ ضرور کیجئے جس میں جگہ جگہ ان کے سفر کی دلچسپ اور پُر از معلومات مکمل کالم، مضمون یا انشائیے کے رنگ میں الگ الگ عنوان سے درج ہے اور ہر کالم کے آخر میں مضمون کی مناسبت سے شامل اشاعت کئے گئے کارٹونز نے "سفر پارے" کی ادبی قدر و قیمت کو اور اجاگر کر دیا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر احمد نصیر صاحب ہیں تو طب کے آدمی مگر تحریر سے فنا دل اور دردوں کے مسیحا لگتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں، جم کر لکھتے ہیں اور پڑھنے والے کو دبوچ رکھتے ہیں۔ ایک سو بارہ صفحات کی یہ دلچسپ و دلربا کتاب صرف نوے روپے کے عوض گلشن ہاؤس، 18۔ مزنگ روڈ لاہور سے دستیاب ہے۔

شب نامہ

مجھے قلم فرہاد کو تیشہ مجنوں کو کشکول دیا
عشق نے دل والوں کو جو بھی کام دیا انمول دیا

یہ ایک شعر ہی "شب نامہ" کے شاعر پروفیسر خیال آفاقی کی بلند پروازی کی ٹھوس دلیل ہے جب کہ ہمارے سامنے شب نامہ کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن اکیس سال قبل 1984 میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ یقیناً ان اکیس سالوں میں پروفیسر خیال آفاقی صاحب نے فکر و فن کے بہت سے سنگ میل عبور کئے ہیں مگر "شب نامہ" کی اہمیت و انفرادیت اپنی جگہ مسلم اور دیرپا ہے۔ ہمارے خیال کی تائید میں ڈاکٹر جہان احمد خان فرآبادی مرحوم کی خیال آفاقی کی بابت رائے ملاحظہ فرمایئے۔ "سلسلۂ نقشبندیہ کے باعمل بزرگ محترم قبلہ صوفی علاؤالدین المجددی کا لائق فرزند وحید اور بدعت سے بے عمل کا پابرو ہوادار(?) اور ان کی محفل کی جان، خوش مزاج داستان، تحریر و تقریر کا مردِ میدان، کردار و گفتار میں سچائی کی پہچان اور قول و عمل میں یکساں، شمالی نوجوان خیال آفاقی ایک بڑا فنکار اور اچھا انسان ہے۔ میں اسے زمانہ طالب علمی سے جانتا ہوں وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا اور علم و دانش میں بڑا ہے بلکہ آج کے بہت سے بڑوں سے بھی بڑا ہے۔ اس کی شخصیت میں قدرت نے اتنی خوبیاں بھر دی ہیں کہ میں ان سب کا ذکر کروں تو نا آشنا لوگ مبالغہ تصور کریں گے۔ وہ فطری اور حقیقی فنکار ہے، قدرت نے گویا اُسے اسی کام کے لئے منتخب کیا ہے۔ علم و ہنر سے اس کا رشتہ بہت مضبوط اور پرانا ہے۔ اس نے بہت چھوٹی عمر میں لکھنا شروع کیا اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی اس تعلق کو منقطع نہیں ہونے دیا۔ بلکہ ادب سے اس کا بندھن روز بروز پختہ اور مضبوط ہوتا چلا گیا اور اب کتاب و قلم کے بغیر اس کی شخصیت کا تصور ہی ناممکن ہے۔" اس قدر مضبوط، مدلل اور واضح اقرار نامہ کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے "تیری آواز مکے اور مدینے"۔ کتاب خوبصورت، خوشنما اور مجلد ہے۔ ضخامت دو سو سولہ صفحات اور قیمت دو صد روپیہ ہے۔ دستیابی کا پتہ: مکتبہ المعمر، 151-A، پلازہ شاپنگ مال 1، 13-D گلشن اقبال کراچی ہے۔

سیف سرونجی، شخصیت و فن

بھارت کے صوبہ مدھیہ پردیش کے شہر سرونج سے گزشتہ چھبیس سالوں سے ادبی جریدہ "انتساب" باقاعدگی اور پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے ہر دلعزیز مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی نامور شاعر، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، رپورتاژ(?)، تبصرے اور اداریے کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں معروف، متفرق شہرت اور تسلیم سے بالا ایک ایسی شخصیت ہیں جن سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کر کے خوشی ہو جاتی ہے۔ ادب کی اس کتاب بازاری میں کتاب شائع کرنا اور پانچ سو صفحات پر محیط کتاب شائع کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ جناب محمد توفیق خان نے یہ کار دشوار بڑی توجہ اور لگن کے ساتھ انجام دیا ہے جس میں کم و بیش ایک صد اہلِ قلم نے ڈاکٹر سیفی سرونجی کی نسبت خامہ فرسائی کی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ حرفِ چند کے عنوان سے فرماتے ہیں۔ "سیفی سرونجی اور ان کے رفقا کی اردو سے بے لوث محبت نے سرونج جیسے دور افتادہ مقام پر اردو کا پرچم بلند کر دیا ہے۔ وہ دو ٹوک لکھتے ہیں اور دل کی بات بڑے دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیتے ہیں۔ وہ تیزی کے ساتھ بدلتے وقت کے تیور بھی خوب پہچانتے ہیں وگرنہ قدیم وقت کو یوں چیلنج نہ کرتے:

جدت کے ہیں ہم شیدا نئے لفظ ہوں سیفی
معنی تو فقط شعروں سے نقاد نکالیں

میں ان کے اخلاص و جستجو کی قدر کرتا ہوں اور ان کی کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں۔" پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کی رائے صرف ایک سفارش نہیں بلکہ اپنے وقت کی معتبر ترین آواز بھی ہے لہٰذا ان کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اولین فرصت میں "سیفی سرونجی، شخصیت و فن" کا مطالعہ کیجئے کہ بے حد مفید بھی ہے اور کارآمد بھی۔ کتاب کی قیمت صرف پانچ صد روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ سہ ماہی 'انتساب' سرونج ایم۔پی، کاروانِ ادب، کوری، بھوپال، مرکزِ ادب، ایم۔ایل۔اے۔ایل۔بی کالج بھوپال بھارت ہیں۔

تاریخ ساز اردو عالمی کانفرنس ٹورنٹو کا انعقاد

ڈاکٹر سید تقی عابدی

دوسری عالمی اُردو کانفرنس ٹورنٹو ۲۰۰۵ء کینیڈا کی تاریخ کی پہلی عظیم الشان کانفرنس ثابت ہوئی۔ ہفت روزہ اُردو ٹائمز یو ایس کینیڈا اور انگلینڈ کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی دوسری عالمی کانفرنس 17، 18 اور 19 جون کو ٹورنٹو کے ڈایز ہوٹل میں منعقد کی گئی۔ جس میں ہزاروں اُردو کے چاہنے والوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں بلا تفریق مذہب و ملت و رنگ و نسل کی مقامی و بین الاقوامی انجمن کی نمائندگی کے لئے تمام حلقوں اور انجمنوں کے افراد شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں کینیڈا کے علاوہ پاکستان، بھارت، انگلینڈ، ویسٹ انڈیز، امریکہ اور یو ایس اے سے بڑی تعداد میں عالمی شہرت یافتہ ادیب، شعرا، نقاد اور دانشوروں نے شرکت کی۔ پاکستان سے تشریف لائے ہوئے سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی سابق صدر مقتدرہ قومی زبان جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے 17 جون کو شام کے 30-7 بجے شمع روشن کر کے اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس کانفرنس میں بھارت سے تشریف لائے ہوئے مہمان پدم بھوشن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اور ساہتیہ اکیڈمی کے صدر نے افتتاحی جلسہ کی صدارت کی۔ جو مہمان پاکستان سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے ان میں عطاء الحق قاسمی صاحب، محترمہ ریحانہ روحی، بھارت سے ڈاکٹر قمر رئیس، زبیر علی خاں صاحب، ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور شاہد حسین ہلالی شامل تھے۔ انگلینڈ سے رضا علی عابدی، ڈیوڈ میتھیوز، عاشور کاظمی، ساجد اور لطف حسین طاہر صاحب تشریف لائے۔ یو ایس اے سے محترمہ نیر جہاں روح رواں ادبی مرکز کیلیفورنیا، ڈاکٹر ستیہ پال آنند پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی، محترمہ ہما شہاب صدر مرکز ادب واشنگٹن، ڈاکٹر عبداللہ سیکریٹری المنائی علی گڑھ، جناب عزیز قریشی شکاگو سے ادب نواز شخصیت منظر فاروقی، محترمہ شفیعہ قادری، انجم کوہ تاج انجم اور امین حیدر، ڈیٹرائٹ سے جناب منصور الٰہی، ڈاکٹر الطاف حجروی اور کئی نامور اُردو ادب کی شخصیتیں موجود تھیں۔ چونکہ عالمی اُردو کانفرنس کا مقصد اُردو زبان و ادب کی خدمت، زبان و ادب کی ترویج و فروغ ہے اس لئے اس میں گیارہ اجلاس، دو جلسے، دو شام غزل اور ایک عالمی مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہ اجلاس غالبیات، اقبالیات، صحافت، اور عصری تقاضے، ترقی پسند تحریک کے ادبی خدمات، نعت اور اُردو ادبیات، جدید ادبیات اور روایات، مرثیہ میں ادبی و اخلاقی اقدار، اُردو فکشن اور خواتین کا اُردو ادب میں موثر کردار کے موضوعات پر منعقد ہوئے۔ کانفرنس کا آغاز ناظم جلسہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تمہید سے ہوا جس میں انہوں نے کہا کہ اُردو بارات حیدرآباد کی محبت، لکھنؤ کی نزاکت، دہلی کی ثقافت، کشمیر کی لطافت، پنجاب کی شرافت، سندھ کی صداقت، سرحد کی شجاعت، لندن کی سیاست تنہا رنگ کی صحافت اور اردو ٹائمز کی حمایت سے لے کر ٹورنٹو آ گئی ہے۔ اس کے بعد افتتاحی جلسہ کی صدارت کے لئے ڈاکٹر نارنگ کو تالیوں کی گونج میں صدر نشین پر بلوایا گیا۔ پھر ڈاکٹر جمیل جالبی کو بحیثیت مہمان خصوصی اسٹیج پر دعوت دی گئی۔ کینیڈا کی ممتاز ادبی شخصیت ڈاکٹر شان الحق حقی کو بحیثیت میزبان خصوصی اسٹیج پر بلوایا گیا اور پھر ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عاشور کاظمی، شاہد ہلالی، رضا علی عابدی، ڈیوڈ میتھیوز، عطاء الحق قاسمی، زبیر علی خاں، خلیل الرحمان، وکیل انصاری اور نسیم اختر اور شاہد ہاشمی کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ آخر میں مختصر سے تعارف کے ساتھ کینیڈا کے ممبر آف پارلیمنٹ جناب جم کیری جانسن کو شاہد ہاشمی صاحب نے اسٹیج پر دعوت دی۔ کانفرنس کی رسم افتتاح ڈاکٹر جمیل جالبی نے شمع روشن کر کے کی۔ یہ پروگرام ریڈیو سے براہ راست نشر کیا گیا۔ مختلف اجلاسوں کی صدارت کرنے والوں نے اس عالمی کانفرنس کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر جمیل جالبی نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ اُردو کے تحفظ اور ترقی کے لئے یہ کانفرنس اُردو کی نئی بستیوں میں بڑی کارآمد ہے اور ایسی کانفرنسوں کا انعقاد ضروری ہے۔ انہوں نے اجلاسوں کے موضوعات کی ہمہ گیری اور مندوبین کی شمولیت کو بہت موثر اقدام بتایا۔ خلیل الرحمان صاحب ایڈیٹر اردو ٹائمز نے بھی اردو کی تعلیم انٹرنیٹ کے ذریعہ عام کرنے کے پروگرام کے بارے میں بات چیت کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ نومبر میں حیدرآباد میں ہونے والی عالمی کانفرنس میں بھرپور تعاون کر رہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ سال 2006ء میں لندن میں کانفرنس منعقد کریں گے۔ اس کانفرنس کے موقع پر یورپ سے اردو ٹائمز کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے خلیل الرحمن نے بتایا کہ پہلا یورپین ایڈیشن لندن سے 14 اگست سے شائع کیا جائے گا۔

افتتاحی جلسہ میں کینیڈا کے ممبر آف پارلیمنٹ عزت مآب جم کیری جانسن نے اپنی مختصر تقریر میں اس کانفرنس کو نیک شگون قرار دیتے ہوئے پارلیمنٹ کے قانون کی اُردو میں ترجمہ کی نوید دی اور اس دستاویز کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر تقی عابدی کو پیش کی۔ افتتاحی جلسہ میں ڈاکٹر عبدالرحمان عبد نے استقبالیہ کلمات میں اُردو پر اشعار پڑھ کر لوگوں کو خوش آمدید کہا اور اس کانفرنس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ جناب وکیل انصاری، نسیم اختر صاحب اور شاہد ہاشمی صاحب نے بھی اس کانفرنس کی ضرورت، اُردو کی تدریس، تشہیر اور ترقی پر دلچسپ باتیں کیں اور اسے ایک لازمی امر قرار دیا۔

افتتاحی اجلاس کے آخر میں خطبہ صدارت ڈاکٹر نارنگ نے دیا۔ انہوں نے کہا کہ اردو آج دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے یہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے یہ ایک ایسا مضبوط تناور درخت ہے جس کی شاخیں ہندو پاک کی زمینوں پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اس طرح اس درخت کا تعلق دونوں طرف ہے اور یہ بھی دونوں ملکوں کی دوستی اور سفارت کا محکم رشتہ ہے۔ وہ اُردو کی بقا اور ترقی

کے قائل ہیں اور اس کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ اُردو آج کل کئی مسائل سے دوچار ہے لیکن ایسے مسائل ہر بڑی اور زندہ زبان کو پیش آتے ہیں۔ جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی تقریر کے بعد افتتاحی اجلاس اختتام کو پہنچا اور پھر عشائیہ دیا گیا۔ رات میں شامِ غزل ہوئی جس میں امریکہ سے آئی ہوئی معروف غزل خواں یاسمین راشد اور جناب طاہر جمال صاحب نے خوبصورت انداز گائیکی سے سامعین کو محظوظ کیا۔ یہ پروگرام آدھی رات تک جاری رہا۔

کانفرنس ہائیر ہوٹل کے دو بڑے ہالوں میں منعقد ہوئی اور اس کے علاوہ اس ہوٹل کے کاریڈور میں شمالی امریکہ کے تخلیق کاروں کی تصانیف برائے مشاہدہ اور مطالعہ رکھی گئی تھیں۔ کچھ مصوری اور نقاشی کے نمونے بھی اس کانفرنس کے ہال کے دوسری طرف سجائے گئے تھے۔ علامہ اقبال کی زندگی پر بنائی گئی فائبر گلاس پر ایک عمدہ نمائش بھی تینوں دن لگی رہی اور لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنی رہی۔

اس کانفرنس میں مناسب داموں پر کتابیں فروخت کے لئے رکھی گئی تھیں جن سے کانفرنس میں آنے والے لوگوں نے استفادہ کیا۔ کانفرنس کے گیارہ اجلاس ہوئے۔ پہلا اجلاس ہفتہ کے دن ساڑھے نو بجے صبح اور آخری اجلاس اتوار کے دن 4 بجے شام ہوا۔ ہر اجلاس (75) منٹ پر مشتمل تھا۔ ان اجلاسوں کی کارروائی اور مکمل روداد طوالت کے باعث پیش نہیں کیا جا سکتی۔ عالمی مشاعرہ جو اس کانفرنس کا آخری جلسہ تھا۔ اتوار کو تاخیر کے ساتھ ساڑھے نو بجے رات شروع ہوا اور 3 بجے رات گئے ختم ہوا۔ اس مشاعرے میں 30 سے زیادہ مقامی اور 20 سے زیادہ مہمان شاعروں نے حصہ لیا۔ مقامی شعراء کو پرچی اٹھا کر بغیر کسی خاص ترتیب کے پڑھنے کی دعوت دی گئی جس کو سراہا گیا۔ اس مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی اور اپنے خطبہ صدارت میں مشاعرہ کی اہمیت اور اس کی افادیت کے ساتھ ساتھ اس میں ہونے والے چند دلچسپ واقعات کا ذکر بھی کیا۔ اس مشاعرہ میں بڑی کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اس کی نظامت وکیل انصاری، ثمینہ شہاب اور ڈاکٹر عبد نے کی۔ اس کانفرنس میں ایک اختتامی اجلاس بھی منعقد ہوا جس میں مرکزی کمیٹی اور انتظامیہ کمیٹی کے عہدیداروں نے سامعین کی رائے سے چند نکات کو منظور کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس اجلاس کا آغاز کرتے ہوئے اُردو کے رسم الخط، اُردو کی تدریس اور اُردو کے مسائل کو حل کرنے کے لئے بین الاقوامی کمیٹی کی تشکیل پر گفتگو کی اور اکثریت آراء سے اُردو کے رسم الخط کی حفاظت، اُردو کی بنیادی تعلیم کی ضرورت اور مرکزی کمیٹی کی تشکیل کی قرارداد کی منظوری ہوئی۔ اُردو ٹائمز کے ایڈیٹر اور عالمی اُردو کانفرنس کے آرگنائزر خلیل الرحمان نے شرکت کنندگان اور کمیٹی کے ارکان کا شکریہ ادا کیا۔

بچیر پتنگ
جھوٹے ڈِکھاندے جھوٹے ڈیندے
ساہتر سے سو لیہا آندے نیں
یاروی پتنگ ہوا دے سائیدی
سچائی دے سنگ وڑیندی
جھولیاں خوشحال بھریندی
سکھ جیائی دے سو تیندی
اِک بک ہون دا ساز وجیندی
یاروے گیت نوں ریت بنیندی
پتنگ ہوا دے سائیدی رہندی!

سرائیکی شاعری کا دامن شاہ صاحب نے جدید رنگوں سے بھر دیا ہے اور اسے ایک وسیع کینوس اور وژن (vision) عطا کیا ہے۔ ان کی سرائیکی نظمیں کسی طرح بھی کسی بڑے شاعر سے کم نہیں۔ ان میں وہی خیال آفرینی، خلوص، فصاحت، فطری پن اور روانی ہے جو کسی بھی بڑی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ "شام کوں نصیحت"، "چھاؤں دیاں بانہوں"، "بعد بلا"، "سچ" وغیرہ ایسی ہی بے مثال نظمیں ہیں۔

سرائیکی غزل اور ماہیے کو انہوں نے سوچوں کی غلیظ دلدل سے نکال کر تجا کر رنگوں کا سا نکھار اور وقار بخشا ہے۔

کیڑے کیڑے لمبے پینڈے راتیں کردے راہندے
جاگن ویلے سوں ویندے فیروز جہاں اساڈے

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

اعجاز کھوکھر

برادرِ عزیز گلزار جاوید، خوش رہیے!

اس بار آپ کے "چہار سُو" نے بڑا انتظار کروایا۔ اتنا اچھا رسالہ باقاعدگی سے نہ ملتا رہے تو کھٹکا سا لگا رہتا ہے کہیں بند نہ ہو گیا ہو۔ بالآخر پیا سپیڈ پوسٹ کے ذریعے ملا تو چین آیا..... حسبِ معمول آپ نے قرۃ العین حیدر کا گوشہ بھی بڑی محنت اور ذہانت سے چھاپا ہے جیسا کہ آپ نے "براہِ راست" کے ابتدائیے میں لکھا ہے، آپ کی اشتیاق اور اتفاقی ملاقات کا ثمر واقعی نئی لذت اور ذائقے کا حامل ہے۔ بھی مضامین بھرپور ہیں اور آخر میں قاری شا کا "بہاروں کی نوید" کے تراشوں کی بدولت بھی مس حیدر کے فن اور ذات کے کئی گوشے روشن ہونے لگتے ہیں۔ عینی کی "کارمن" میری بھی پسندیدہ کہانی ہے بڑے مزے سے آخری سطور پر آتے آتے قاری تھک کر رہ جاتا ہے.....

آپ نے بڑی محبت سے میری صحت کا پوچھا ہے میں اب اچھا ہوں..... تھیں، اس دوران کوئی کہانی نہیں ہوئی، بس پڑھائی کے ہوں اور پڑھ پڑھ کر اپنے آپ کو خود سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ آج کل ایک نیا ناول ٹھہرے میں لے رہا ہے اگر ہمت بنی رہی تو اسے ہاتھوں میں لے لوں گا..... عطیہ سکندر علی نے "تخلیقِ عصر" میں میری تحریروں کے تعلق سے بڑی چاہ اور محبت سے کام لیا ہے انہیں پڑھ کر تو بھی جی چاہتا ہے کہ گاتے ہی رہو تو ٹے۔

جوگندر پال

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیم و کریم

قرۃ العین حیدر سے منسوب "چہار سُو" کی اشاعتِ خاص کا تحفہ پا کر بے حد خوش ہوا اور شرمندہ بھی..... خوشی رسالے کے موضوعات سے اپنی پرانی اور گہری دلچسپی اور عینی آپا کی مجھ حقیر پر نوازشات دیرینہ کے باعث..... اور شرمندگی اس بنا پر کہ میں اتنے صاف ستھرے رسالے سے اب تک کیوں محروم رہا..... اس سے پہلے میں نے اس پرچے کے ایک دو ہی شمارے دیکھے ہوں گے!

جاریہ شمارہ رسالے کی چودھویں جلد کا ہے..... کیا پچھلے چودہ برسوں کا فائل اپنے ریکارڈ کے علاوہ فروخت کے لیے بھی آپ کے پاس دستیاب ہے؟ (کچھ شمارے "مسنگ" ہوں تو بھی مضائقہ نہیں)..... اگر ایسا ہو سکے تو مجھے "چہار سُو" کا پورا سیٹ VPP کے ذریعے بھیج دیجیے۔ آپ کا بڑا کرم ہوگا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

برادرم گلزار جاوید۔ السلام علیکم!

آپ کی محبتوں کا پرانا اسیر ہوں۔ یاد ش بخیر ظفر و کرامت کے شہنشاہ ضمیر جعفری بڑی محبت سے آپ کا تذکرہ کرتے تھے اور ہمیشہ "چہار سُو" کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنے کی تلقین کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ پنڈی کے اس جریدے کو زندہ و تابندہ رکھنا ہے سو آپ نے بھی ان کی یہ بات نبھائی اور "چہار سُو" کو چہار سُو پھیلا کر زبان و ادب کی خدمت کی۔ یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ ان مشکل حالات میں پرچے کو زندہ رکھنا اور ادیبوں و شاعروں کو قرطاس اعزاز دینا، ان کے بارے میں انٹرویو چھاپنا اور افسانوں، غزلوں و نظموں سے دلکش بنانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ گلزار جاوید! آپ اس کام کو بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر پر ترتیب دیا ہوا نمبر پسند آیا۔ عینی آپا کی زندگی، شخصیت اور فن پر آپ کا انٹرویو سر سکا ہے..... مگر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کہیں کہیں وہ سوالات سے جھنجلا جاتی ہیں کچھ اکتاہٹ اور غصے کا اظہار بھی ملتا ہے وہ منجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں ان کی ہر تحریر میں دلکشی ہوتی ہے۔

نظمیں غزلیں آپ کے جریدے میں اچھی ہوتی ہیں۔ اس شمارے میں ہانی انصاری اور مشکور حسین یاد نے منیر نیازی کی بعض تراکیب پر درست اعتراض کیا ہے۔ منیر نیازی زبان کے استعمال اور تراکیب میں کوتاہیاں کر جاتے ہیں بے تکی مصرعے اور تاکات کی بہتات ہے مگر لاہور کے حلقے اس سے گریدہ ہیں۔ نظر آتا ہے کہ منیر نیازی کے گرد جمع قصیدہ خوانوں اور قصیف نگاروں کا بھرم جلد کھل جائے گا۔

خطوط میں بعض احباب میری غزلوں کے اشعار کا حوالہ دیتے ہیں ان کے توصیفی کلمات کے لئے شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں۔

نیر جہاں، ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ، قیصر نجفی، سری واستو، سعد نثار، ترابی کی نظمیں پسند آئیں۔ غزلوں میں مشکور یاد، شبنم رومانی، افتخار عارف، رفعت سروش، جاوید شاہین، مامون ایمن، عبدالرحمان عبد، مناظر حسین عاشق ہرگانوی، سلطان میر ولی اور قیصر نجفی کی غزلوں میں تازگی اور ندرت ہے۔

محسن احسان

بھائی جان نگار اجاوید صاحب آداب!

آپ سے دو ملاقات کے تسلسل کے بعد طالب ہوں۔ بے حد شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ پر طالعیتی آپ کی بھابھی اس دوران میں سخت صبر آزما حالات سے گذر رہی ہیں اور میں ان کے ساتھ ساتھ آدھا زندہ آدھا مردہ جیسے نیند میں چل رہا ہوں۔ گذشتہ ۱۲ برس سے وہ ایک گردے پر زندہ تھیں۔ اس برس کے شروع میں اس گردے میں بھی Blockage نے کا پتا چلا اور ہوتے ہوتے احتیاط کے باوجود مارچ تک %95 رکاوٹ آ گئی۔ جان کا خطرہ لاحق ہو گیا تو گردے کی سرجری کر کے اس میں ایک اسپرنگ رکھ دیا گیا۔ کچھ فائدہ ضرور ہوا ہے لیکن ان کا Creatinine level ابھی تک کم نہیں ہوا۔ اللہ رحم کرے گا۔ میں نے یونیورسٹی سے مکمل طور پر فراغت حاصل کر لی ہے اور قدم بقدم ان کے ساتھ ساتھ حالات سے مقابلہ اور چہار سُو کا انتظار کر رہا ہوں۔

ستیہ پال آنند

پیارے گلزار جاوید مطلب یہ ہے کہ نہایت محترم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم!

آخر آپ نے جتنی آپا پر بھی قرطاس اعزاز نکال ڈالا بھر انتصار کے ساتھ ان کی چیزیں بھی سامنے لے آئے کچھ باتوں کا بھی پتا چلا۔ اُن کے بارے میں دیدہ ملی قلم کے خیالات بھی معلوم ہوئے لیکن خود قرۃ العین کی شخصیت اتنی بڑی ہے کہ یہ سب باتیں عام اور معمولی نظر آتی ہیں۔ غالباً 1999 کی بات ہے اُس زمانے میں جتنی بھی لندن آئی ہوئی تھیں اور میں بھی وہاں تھا۔ ایک صاحب نے غالباً مجاہد ترمذی مرحوم نے مجھے فون کیا کہ جتنی صاحبہ پر آپ کچھ کہنا چاہیں گے میں نے جواب دیا جتنی ہم تو اُن کے عاشقوں میں سے ایک عاشق ہیں۔ انھیں کبھی لاہور میں حلقۂ ارباب ذوق کے ایک جلسے میں کچھ پڑھتے ہوئے پہلی بار دیکھا اور حسب معمول ہم اُن پر عاشق ہو گئے ..... لہٰذا ایک عاشق کے پاس کہنے کو بے شمار باتیں ہوتی ہیں۔ اُن کے فن سے زیادہ میں اُن کے حسن و جمال پر بہت کچھ کہنے کو صدقِ صد حاضر ہوں ..... مگر غالباً موصوف نے میری بات اچھی طرح سمجھی نہیں اس لئے خیریت گذری۔ میں نے جس خاتون کو جوانی میں دیکھا ہوا ہے میرے لئے اُس کا بوڑھا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں اُسے اُسی نظر سے دیکھتا ہوں۔

مشکور حسین یاد

کرمفرما گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون

انتظار کی حالت میں جولائی اگست کا "چہار سُو" آج کی ڈاک سے ملا۔ شکریہ دہلی میں آپ غالباً مارچ اپریل کا شمارہ لے کر آئے تھے۔ مئی جون کا شمارہ مجھے نہیں ملا ہے۔ قرۃ العین حیدر سے آپ ملے اور ان سے انٹرویو لینے میں کامیاب رہے یہ بڑی بات ہے۔ ان پر گوشہ پسند آیا۔ دیگر تخلیقات پڑھ کر خط لکھوں گا۔ حیدر صاحبہ سے آپ کے سوالات اکیسویں صدی کے ہیں اور ان کے جواب کا کیا کہنا۔

میری شخصیت پر کتاب ابھی ابھی آئی ہے آپ کے ساتھ ایک ہی تصویر مجھے ملی تھی وہ شامل ہے یہی تصویر جولائی کے "پرواز" لندن کے سرورق نمبر ہم پر شائع ہوئی ہے۔ دونوں کتابیں جلد ہی ارسال کروں گا۔

آپ سے ملاقات کی خوشبو میں ابھی تک محسوس کرتا ہوں۔ زیر ترتیب "نوبہار" میں آپ سے انٹرویو شامل کر رہا ہوں۔ آپ کے لئے مجھے انٹرویو پر مضمون ادھورا رہ گیا تھا اب اسے مکمل کروں گا۔ یہ مضمون ذرا طویل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

پیارے گلزار جاوید صاحب آداب!

جولائی اگست کا "چہار سُو" ملا۔ اب کے یہ شمارہ پہلے شماروں سے بھی آگے نکل گیا۔ انٹرویو کرنے کا ڈھنگ آپ کو آ گیا ہے۔ ایئر مارشل اصغر خاں صاحب کا انٹرویو کمال کا ہے۔ ایئر مارشل صاحب اپنی قومی خدمات اور ذاتی کردار کے باعث وطن عزیز کے ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ انہوں نے نکھر پور انٹرویو دیا ہے۔ پہلا انٹرویو جس کو اوا ہے "خلیجی ممالک میں اردو" کے موضوع پر آپ نے بہت اچھا مقالہ لکھا۔ امید ہے وہاں کی تقریب میں بہت پسند کیا گیا ہو گا۔ خلیجی ممالک میں اردو کے مشاعروں اور تقریبات کو آپ نے "میلے" کہہ کر بہت موزوں تشبیہ دی اور بہت صاف صاف اور کھری کھری باتیں کیں۔ ہمارے زمانے میں سچ بولنے کی تو رسم ہی نہیں رہی۔ ہر کوئی پی آر بنانے میں لگا ہے۔ ملک زادہ جاوید نے بشیر بدر کی شخصیت کی رنگا رنگی کو بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بشیر بدر بھارت کے دو تین بہت اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے کئی اشعار ہمارے ہاں بھی عام ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ غیر فانی شعر اور ایسے ہی اور بھی:

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

کتابوں پر تبصرے بس ٹھیک ہیں۔ غزلیں اچھی ہیں مگر غزلوں سے نیا دہ شاعر اچھے ہیں۔ افتخار عارف اس عہد کے صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں دل میں اتر جانے والی خوبی بدرجۂ اتم ہے۔ حافظ نے سچ کہا تھا "قبول سخن خدا داد است" مگر یہ مدیر کے نام سے آپ کا نوٹ بھی دلچسپ ہے خصوصاً عنوان۔

اکبر حمیدی

عزیز دوست گلزار جاوید بہت بہت سلام!

میں اپنی شکستہ پائی کے ہاتھوں اپنے آپ کو کبھی کبھی مطعون کرتا

ہوں کہ بدن میں کام کرنے کی قوت بھی ہے اور قلم میں روشنائی بھی ہے مگر پھر بھی کچھ کمی محسوس کرتا ہوں۔ اب آپ دہلی آئے اور میں آپ سے مل کر لطف اندوز نہ ہو سکا بہرحال آپ نے یاد رکھا اور پرچہ ملک زادہ جاوید کی معرفت مل گیا..... میاں آج کل تو کوئی قدر نہیں ہے کسی شاعر سے یا سیمینار میں یاد رکھے آپ نے قرۃ العین حیدر پر نہایت اچھا گوشہ شائع کیا ہے آپ کی علم و ادب سے سچی محبت اور لگن کا ثمرہ ہے کہ "چہار سُو" چاروں کھونٹ ہی توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

رفعت سروش

بھائی گلزار جاوید۔ السلام علیکم!

تازہ شمارہ اپنے "گریۂ مدیر" اور قرطاس اعزاز سمیت کچھ مثبت تبدیلیوں کا غماز تھا۔ خدا کرے یہ تبدیلیاں "چہار سُو" کے لئے نیک فال ثابت ہوں۔ قرۃ العین حیدر کے سلسلے میں آپ نے جن مضامین کے ساتھ عموماً اور جس انٹرویو (براہ راست) کے ساتھ خصوصاً "چہار سُو" کے صفحات کو رونق بخشی ہے اُن سے موصوف کی طبیعت کا تضاد کھل کر سامنے آیا ہے۔ پھر وارث علوی کا ایک پرانا مضمون "سفینۂ غم دل" کا شامل ہونا بھی شاید "چہار سُو" کی روایات کے خلاف ہے بہرحال مجموعی طور پر یہ حصہ خوب ہی نہیں بہت خوب ہے۔

"مجلس چہار سُو" میں آپ نے جناب اصغر خان سے بہت سارے انکشافات کروا دیئے ہیں۔ جن سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ چلتے چلتے "آئینۂ ایام" کا ذکر کیوں نہ ہو جائے جس میں ڈاکٹر بشیر بدر پہلی مرتبہ ملک زادہ جاوید کے جملوں کی کاٹ سہے آئے ہیں۔ عالمی اردو کانفرنس میں آپ کا پڑھا گیا مضمون معلومات کے ہی نہیں فکر کے بھی نئے در وا کرتا نظر آیا۔ مبارک ہو۔

غالب عرفان

میرے گلزار خوش رہو۔

"چہار سُو" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا جس کے لئے میں دل کی گہرائیوں سے آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے امریکہ میں بھی اپنی محبت اور ادب دوستی میں ثابت قدمی کو برقرار رکھا۔ اس دیار غیر میں اُردو کا تحفہ دستیاب ہو جانا ایک بیش قیمت تحفے سے کم نہیں ہے کسی ادیب و شاعر کے لئے۔ بہت بہت شکریہ۔

سرورق پر قرۃ العین حیدر کی فوٹو دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اور براہ راست میں آپ کے انٹرویو کا طور و طریق قابل ستائش ہے۔ اُن کا آپ کے سوالوں کا اُن کے اپنے لہجے میں جواب دینا اور آخر میں اُن کا کہنا "تعصب کسی سے مت رکھو ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات کہہ رہا ہو مجھے نیا دھنے کی عادت ڈال لیجئے۔"

محمود ہاشمی کا جدید افسانے کا عطر آتا ذکاری شاکا بیاروں کی نوید خصوصی تراش خراش، ارشاد احمد صدیقی کا "مردِ خوخا" کس خوبی سے انہوں نے ان کے ساتھ گزرے دنوں کا خوبصورت انداز سے تذکرہ کیا۔ اور وقار جاوید کا ابر کرم بھی اچھا لگا۔ ہر ایک مضمون اپنی جگہ اچھا ہے۔ حصہ نظم و نثر و غزل پسند آئے۔ پل پل سرو استو ہد کا ایک خانگی المیہ اور حنیف ترین کا شہوار آنا پسند آئے۔

یہ کام آپ نے بہت اچھا کیا کہ آپ نے اپنے مضمون "شعلگی" کما لک میں اُردو کو پرچے میں شامل کر لیا تا کہ وہ لوگ جو ساہتیہ اکادمی دہلی میں حاضر نہ ہو سکے وہ بھی اس مضمون کا لطف اُٹھا سکیں۔ جو بہت کھل کر اور صاف صاف کیا گیا ہے۔

یہ کو حرف چند تیج ہیں پر دل میں رکھا تھا کہ اک روز یہ دوا تیرے کام آئے گی، اور آخر میں آپ کا "مجلس چہار سُو" میں جس طور سے ویز مارشل (ر) اصغر خاں صاحب کا انٹرویو لیا ہے وہ یقیناً آپ ہی کا حصہ ہے۔ حیران ہوں کہ ایک اردو ادب کا شخص اس قسم کے سیاسی اور علمی سوال اور وہ ایسے ایسے کہ عقل حیران ہو۔ بہت ہی مشکل کام ہے۔ وہ رہ کر سوچ رہا ہوں کہ آپ کو کوئی بین الاقوامی سطح میں کسی ایسے ادارے کا ممبر ہونا چاہئے تھا۔ آپ کہاں اُردو ادب تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ جس طور سے آپ نے سوال کریدا کرید کر کئے ہیں میں تو میرے گلزار انگشت بدنداں ہوں۔ اس مضمون کے لئے (انٹرویو) میری جانب سے بہت بہت مبارک قبول فرمائیں۔ کمال ہے مکمل تواریخ کو عوام کی نظروں کے سامنے رکھ دیا..... میرے بھائی یہ آپ ہی کا کام ہے۔

اور آخر میں نعت سرورِ عالمؐ جناب عابد انصاری بے حد پسند آئی۔ یقین مانیے پڑھ کر وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ اور یقیناً عابد بھائی نے عالم وجد میں ہی یہ لکھی ہو گی:

میں آپ کے کرم سے یہاں بھی ہوں سرفراز
اور پاؤں گا وہاں بھی اماں آپ سے حضورؐ

یوگیندر بہل تشنہ

برادرم گلزار جاوید۔

سلام مسنون۔ خیریت موجود خیریت مطلوب۔

"چہار سُو" کے سرورق پر قرۃ العین حیدر کی تصویر دیکھ کر' کہ جسے آنکھوں والے "عینی" اور دل والے "ٹھنڈک" کہتے تھے' کہتے ہیں اور جانے کب تک کہتے رہیں گے..... خیال آیا کہ خواب چاہے کتنے ہی تند رہوں خواب ہی ہوتے ہیں۔ مگر یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ "آگ کا دریا" ناول لکھ کر "عینی" نے صدیوں پرانے ایک خواب کو جگا کر ہمیں دکھا دیا کہ اگر لکھنے والے کے پاس دیدۂ بینا' ذہن رسا اور دردمند دل ہو تو وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر آج بھی وہ سب کچھ دیکھ اور لکھ سکتا ہے جو پڑھنے کے قابل ہو اور جو صدیوں پہلے گذر چکا ہوتا ہے یعنی زمانہ ایک سچے اور کھرے ادیب کے تابع ہوتا ہے

اُس پر حاوی نہیں ہوتا۔

"تجّی" کی جو تصویر آپ نے "چہار سُو" کا سرورق بنائی ہے وہ بیک وقت اُس کا بچپن بھی ہے، جوانی بھی ہے اور بڑھاپا بھی! کہ اس میں معصومیت بھی ہے، شرارت بھی ہے اور متانت بھی!! یہ بھولپن، الھڑپن اور بڑپن کی ایک نادر تصویر ہے جس کے لئے آپ کی (Selection) یعنی چناؤ کی داد نہ دینا سراسر زیادتی ہوگی۔ اور کم ظرفی میں اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

دل نواز دلؔ

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب۔

چہار سُو کا حالیہ شمارہ جس کا ایک حصہ آپ نے تجّی آپا کی نذر کیا ہے بے حد و حساب ہے۔ تجّی آپا پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ شاید اور کی اب گنجائش نہیں ہے۔ امارت کتابی دستاویز کی کیوں نہ ہو، وقت گزرنے کے ساتھ اپنا عروج کھو بیٹھتا ہے لیکن آپ جس طرح اس پل صراط سے گزر گئے ہیں وہ آپ کے قلب سلیم کا مظہر ہے۔ تجّی امارت کے تحت غزلوں کے مصرعے کے مصرعے پروف کی غلطیوں کا شکار ہو گئے ہیں جس سے ان پر ساقط الوزن ہونے کا عیب صادر آتا ہے۔ غزل کے اشعار میں ذرا سا لفظ بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو قاری کو جو کوفت اور پریشانی ہوتی ہے اس سے آپ واقف ہیں۔ پھر بھی میں نے غزلوں کے اس گلشن بے خار سے بے حد حظ اٹھایا۔ بشیر بدر کے حوالے سے میں ملک زادہ جاوید کی اس طرح کی تحریر پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔ حالیہ تحریر میں ذرا سی تحریف ہے اور گرد و پیش کے ضمن میں آتی ہے۔ باتیں اگر ہوں بھی تو فقط ان کی شاعری کے حوالے سے ہوتی چاہئیں میں بھی ان کی شاعری کے حوالے سے سرسبز میں ان کی غزلیں اور اس پر ایک تنقیدی نوٹ (تحسین نہیں) چھاپ چکا ہوں۔ اور ان کی شہرت کو سستی Media gimmick کے آئینے میں پرکھ چکا ہوں۔ (ترانہ اس خط کے ساتھ ارسال ہے)۔ بشیر بدر کے معاملے میں میں بالکل یہی الفاظ ذرا سی تبدیلی کے ساتھ لکھنا چاہوں گا کہ یا خدا اسے معاف کر دے کیونکہ وہ نہیں جانتا وہ کیا کر رہا ہے۔ عالمی اردو کانفرنس میں آپ کا پڑھا گیا مقالہ خلیجی ممالک میں اردو بے حد Thought provoking ہے اور کئی سوالات کو جنم دیتا ہے جن کے جواب بادی النظر میں ناممکن ہیں۔ ہماری اردو سے محبت کے جذبے تو بہت ہیں لیکن عملی طور پر اس کی بقا کے بارے میں ہم کتنی سادہ ہوئے ہیں۔ عطیہ سکندر علی نے نئی کتابوں کا تعارف بہت خوب کروایا ہے۔ دل رابطے کے تحت اپنے عزیز قیصر تجّی سے اتنی درخواست کروں گا کہ معاف کرنا خاص طور پر اپنے حریفوں کو بہت بڑی بات ہے کیونکہ شعر کی تنقید، تحسین سب سے آسان ہنر یا گُر ہے جو آپ کی شہرت کی ہوس کو "شناخت" کرتی ہے۔

میں غزل کے شاعر ہونے کے ناطے طول طویل خطوط سے پرہیز کرتا ہوں لیکن آپ کے رسالے نے یہ سب کچھ لکھنے پر مجبور کر دیا جس کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

کرشن کمار طور

برادرم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم!

پرچہ ملا اور شاعری کے علاوہ سارے کا سارا ایک ہی نشست میں پڑھا گیا..... قرۃ العین حیدر کا گوشہ لاجواب ہے..... ایک نظر میں اُن کا پورا کام سامنے آجاتا ہے۔

اصغر خاں صاحب اس گہرے سمندر میں ایک صاف مچھلی ہیں..... اُن کا انٹرویو پڑھا اور مستقبل سے کچھ امید بندھی..... شاید کوئی اور اُن جیسا پیدا ہو جائے..... وہ سیاسی طور پر ناکام ہے..... لیکن اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں..... اس کی ذمہ دار پوری قوم ہے۔

شمشاد احمد

محترم گلزار جاوید صاحب۔

برصغیر کی محترم شخصیت محترمہ قرۃ العین حیدر پر قرطاس اعزاز کا قرعہ فال کرو اتی آپ نے اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ ان سے انٹرویو لے لینا بھی آپ ہی کا حصہ ہے۔ تذکرہ کشور کرم کا مضمون کافی معلوماتی ہے۔ خوارث علوی، محمود ہاشمی اور ڈاکٹر قمر رئیس کے مضامین کے علاوہ موصوفہ کی تحریریں بھی پسند آئیں۔ حصہ شعر و شاعری میں مشکور حسین یاد، محسن احسان، افتخار عارف، رفعت سروش اور یوگیندر بہل تشنہ کی غزلوں نے متاثر کیا۔ البتہ تبصرے پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ چہار سُو کو جو کتاب تبصرے کے لئے آتی ہے وہ اعلیٰ معیار کی ہوتی ہے اور اس میں کوئی خامی یا پہلو نظر ہی نہیں آتا۔ بحر صورت پرچے کی ترتیب، تدوین اور سرورق حسن و جمال کا بہترین نمونہ ہے۔

نارنگ ساقیؔ

حضرت گلزار جاوید صاحب آداب اور بہت سلام!

قرۃ العین حیدر صاحبہ کا انٹرویو اگر بلا تبصرہ کے عنوان سے ہوتا تو بھی خوب ہوتا۔ اس شمارے میں بشیر بدر صاحب کے حوالے سے کچھ چھپا، اگرچہ میں بشیر بدر صاحب کی ذات کے بارے میں کچھ جانتا تو نہیں ہوں لیکن اگر یہ سب نہ چھپتا تو بھی اچھا ہی ہوتا۔ ڈاکٹر عمران مشتاق کا "سیاہ فام" خوب تھا اور سیاہ فاموں کے علاوہ بھی کئی رنگ کے لوگوں کا ترجمان تھا۔ قیصر تجّی صاحب کی نظم شہر یار سال پڑھ کر بے چینی پھر کچھ بڑھ گئی۔ اصغر خاں صاحب کا انٹرویو اچھا تھا اور ان کے جواب کئی جگہ ان ہی کی چغلی کھاتے ہوئے محسوس ہوئے مگر باوردی جرنل کی حکومت سے ریٹائرڈ ائر مارشل کی سیاسی جماعت بہر حال بہتر ہوگی۔ کاش کہ اس عفریت سے ہماری جان چھوٹ سکے۔

فیصل عظیم

بھائی گلزار جاوید! سلام مسنون۔

آپ کا موقر جریدہ "چہار سُو" پرسوں موصول ہوا۔ ماشاءاللہ بہت خوبصورت ہے اور عینی آپا پر آپ نے قرطاسِ اعزاز شائع کرکے اچھا کام کیا ہے۔ میں تو سوچتا ہی رہا اور کوشش بھی کی مگر حوصلہ افزا تحریریں موصول نہ ہوئیں۔ بہرحال مبارک ہو۔

باقی تحریریں بھی پڑھیں۔ سالوں کرنٹ لگا جاتا ہے اور پرچہ سب کو روانہ کرکے جانا چاہتا ہوں۔ سو اسی میں الجھا ہوا ہوں۔ اگست کے آخر میں سفر ہو گا دعا کریں سب ٹھیک رہے۔ چہار سُو برابر مل رہا ہے مگر میں اوروں کی طرح آپ کو رسید بھی نہیں بھیج پاتا شرمندہ ہوں۔ مگر خوشی ہوتی رہے گی جو بن دیکھے ہوتی ہے اور قائم ہے۔ دوستوں کو سلام کہیں!

احمد زین الدین

برادرم گلزار جاوید صاحب آداب و سلام!

"چہار سُو" کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ آپ کے پرچے کی خاص پہچان اس کے انٹرویو ہیں۔ اس بار ائر مارشل (ر) اصغر خان صاحب کا انٹرویو بے حد پسند آیا۔ موصوف کے کردار کی عظمت ان کے خیالات سے ظاہر ہو رہی ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کے بارے میں کافی جاننے کو ملا۔ مبارکباد۔ ان کا افسانہ "کارمن" پسند آیا۔

انیل ٹھکر

محترم مدیر چہار سُو۔ سلام و رحمت!

جولائی اگست ۲۰۰۶ء کا چہار سُو محترمہ قرۃ العین حیدر کے قرطاسِ اعزاز سے سجی ادبی سوغات ..... اور ..... سوچتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ملا ..... اور کیا چاہئے!

'ایک لمحے کے لیے دل ڈوب گیا' ..... پڑھتے ہوئے بہت دلچسپ پیرائے کا لطف اٹھایا ..... یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ... کہ ... انہیں (بانو آپا کی طرح عینی آپا کہنے پر وہ خفا نہیں ہوں گی نا) بھی گڑیوں سے کھیلنا اچھا لگتا تھا ..... کیونکہ ..... بہت سے لوازمات کے باوجود بھی ..... گڑیاں ایک ایسا حوالہ ہیں ..... جن میں پورا بچپن مجسم نظر محسوس ہوتا ہے .....

'براہِ راست' میں آپ کے سوالات بھی ہمیشہ کی طرح کہیں کہیں ..... تیکھے اور کٹیلے ..... تھے۔ مگر ..... عینی آپا کے جوابات بھی ان کے مخصوص زاویۂ فکر و نظر کے ..... برجستہ و سچے ترجمان تھے ..... ستاروں سے آگے ..... گل نشانی ..... ہر کرم ..... اور ..... بہاروں کی نوید کے ذوقی و شخصی کوائف ..... انٹرویوز ..... تقاریر ..... مضامین ..... تخلیقات سے اقتباسات اور ممتاز معاصرین کی آراء نے فن کے نظریات و افکار کو سمجھنے میں .... مختلف پہلوؤں سے معاونت کی ..... ان کی کتب کے ارتقائی سفر کو تہذیبی و ثقافتی حوالے ..... اور ..... سیاسی و سماجی تحریکات کے ساتھ ..... توضیح ہوئی۔

'سفینۂ غمِ دل' کے ..... میرے بھی صنم خانے' سے تقابلی مطالعہ و موازنے ..... نیز محترم سید وقار عظیم کے تنقیدی تجزیے ..... محترمہ عصمت چغتائی کی بے تکلف رائے ..... نے ..... قاری کو اس مخصوص عہد کے نقطۂ نظر سے آگہی دی۔ 'قوموں کا تہذیبی تشخص' ..... میں نہایت عمدگی سے ان کی تخلیقات کے بالترتیب جائزے کو جملہ فنی محاسن کے ساتھ ..... تاریخی و تہذیبی تناظر میں پیش کیا گیا ہے .....

'سیاہ فام' ..... بیرونی ممالک میں بسنے والے ..... سیاہ فاموں کے عادات و اطوار کے ..... گہرے مشاہدے پر محیط ہے .....

صدیقی صاحب نے نہایت اپنائیت بھرے لہجے ... اور ... محبت آمیز انداز میں ..... 'جوہر دوستی' کو آشکار کیا ... اور ... جناب جوہر میر سے مربوط رابطوں سے مزین ..... مکتوبوں ..... ملاقاتوں شاعروں کو تر و تازہ کیا...

'خلیجی ممالک میں اردو' ..... کا جو مبنی بر حقیقت جائزہ پیش کیا گیا ... اور ... جس طرح اس جائزے کے پس منظر میں اردو زبان کے تحفظ و فروغ و ارتقاء کے لئے ..... دُور رس نکات ... اور ... مخلصانہ تجاویز .... ہمدردانہ مشاورت کے ساتھ پیش کئے گئے ..... وہ یقیناً بہت سراہے جانے کے لائق ہے ... اور ... متنوع زاویوں سے عملدرآمد کے لئے بھی ..... نہایت مستحسن ہے۔

'مجلس چہار سُو' میں ..... ائر مارشل (ر) اصغر خان صاحب سے انٹرویو ..... اس نکتہ نظر سے بہت اہم رہا ... کہ ..... سیاسی تناظر میں آپ کے برمحل ..... بروقت ..... بے لاگ سوالات کے جوابات کی روشنی میں ... پاک سرزمین کا سیاسی منظرنامہ ..... مختلف دہائیوں کے اہم حالات' واقعات و حادثات کے ..... ملکی و بین الاقوامی حوالوں سے بھرپور اجاگر ہوا ..... بلکہ کئی مخفی ... معاشی و معاشرتی پہلوؤں کی ..... نقاب کشائی بھی ہوئی .....

میری غزل کے مقطع کا مصرعہ ثانی ..... اس طرح ہے

" کس بات پر یہ لوگ چلیں راستے جُدا

یوم آزادی کی روشنیوں اور رنگوں ..... کے استقبال کی خواہش لئے.

شگفتہ نازلی

محترم المقام گلزار جاوید صاحب آداب!

اللہ کرے آپ خیر و برکت اور علم و ادب سے ہمیشہ ہمکنار رہیں۔ فقیر کی بھی دعا ہے رب کریم سے آپ کا خوش اسلوبی سے ترتیب دیا ہوا پیارا مجلہ چہار سُو۔ مارچ اپریل کا شمارہ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ کلام۔ مضمون۔ خطوط بھی کچھ اچھا لگا۔ منیر نیازی صاحب سے آپ کی گفتگو اور ان کے کلام کا انتخاب بھی خوب تھا۔ آپ کے دلچسپ سوال و جواب سے ان کی شخصیت کے کئی اہم گوشے بھی روشن ہوئے۔ آپ سے بات چیت کی روشنی میں حضرت منیر بہت

خود پسند نظر آئے ہمارے لیے نئی بات تھی۔

مارچ اپریل کے شمارے میں منظر ایوبی صاحب کا بندہ کے شعر کو پسند کیا اُن کی انقلابی سوچ کا مظہر ہے:

اپنا حق بڑھ کے چھین لیا ہو - یوں دکھاؤ نہ ہاتھ مل مل کے

اور احمد ظہور صاحب کا ایک مصرعہ کئی شعر تشریح کر گیا:

آؤ بچوں کا احترام کریں - یہ تو وارث ہیں آج کل کے

ایک ایسی اپیل جس پر ساری دُنیا کو اور برصغیر کے لوگوں کو خصوصاً دھیان دینا چاہئے۔ اتنی خوشی ہونے کی چند دلیل ہے۔ ان دو حضرات کا بھی شکریہ اور آپ کا بھی۔ ڈاکٹر کیول دھیر صاحب کا جن کے توسط سے ہمیں چہار سُو دستیاب ہوا۔ سوا کرے ہمیشہ ملا ہوا رہے آمین۔ جناب ساگر آپ کو بہت بہت سلام کہتے ہیں۔

اجیت سنگھ حسرت

محترم گلزار جاوید۔ سلام عقیدت!

اس بار قرطاس اعزاز اور دیگر تخلیقات خوب ہیں۔ ''چہار سُو'' ایک غیر متنازعہ پرچہ ہے اور اسے آئینے کی طرح صاف وشفاف ہی رہنا چاہئے۔ رسل و رابطے چلتے ہوں نہ کہ کیلئے ایک دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے احترام اور شفقت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ اپنے دو شعر ''چہار سُو'' کی وساطت سے دوستوں کی نذر کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا:

کیوں اب دلوں میں پہلی سی وارفتگی نہیں
اِک دوسرے کے ساتھ وہ وابستگی نہیں
ہو نام باہمی وہی نام نام ہے
شائستہ نام کیا ہے جو شائستگی نہیں

غفار بابر

عزیز محترم۔ سلام و نیاز!

آپ کا انتہائی ممنون ہوں بلکہ جذبات کی قدر اور حقیقی ترجمانی کے لئے اپنے پاس الفاظ نہیں پاتا ہوں کہ آپ نے چہار سُو کی شکل میں ایک قیمتی دستاویز مرحمت فرمادی ہے۔ قرۃ العین میری ہم ضلع ہیں۔ ان کا قصبہ نہٹور ہے اور میرا قصبہ سیوہارہ۔ جہاں کی سرزمین سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا حفظ الرحمٰن اور نہال سیوہاروی کا تعلق ہے۔ قرۃ العین میرے پھوپھا ریاضت حسین کی بہت قریبی عزیز بھی ہیں۔

خوشی اس لئے زیادہ ہوئی کہ میری نواسی جس نے اس سال ایم اے اُردو پارٹ دوم کا امتحان دیا۔ ایسی دستاویزات جمع کرنے کا شوق رکھتی ہے اور اردو کی تحصیل میں نہایت دلچسپی لیتی ہے۔ میں اس قسم کا لٹریچر اُسے فراہم کرتا رہتا ہوں۔ آپ کی عنایاتِ خسروانہ سے بڑی کرائی محنت مجھے مل گئی اور میں نے

اس کے حوالے کردی۔ میں بے حد ممنون ہوں آپ کی اس توجہ کا۔

محشر زیدی

محترم جناب گلزار جاوید صاحب۔ تسلیمات!

چہار سُو کا آخری موصولہ شمارہ ہی میرے لئے تازہ ترین شمارہ ہے اور یہ ہے ستمبر اکتوبر ۲۰۰۲ء کی اشاعت یعنی ستیہ پال آنند سے منسوب پرچہ اس کی رسید شکریہ اور مبارکباد کے لئے میں آپ کی اور ڈاکٹر آنند دونوں کی قرضدار ہوں۔

اس پرچے کے حوالے سے ایک اور اہم بات جو فوری توجہ کی متقاضی تھی مگر تشنہ رہی وہ یہ کہ جناب قیصر نجفی صاحب ''رسل و رابطے'' میں میری ایک غزل جو شاید کسی پچھلے شمارے میں چھپی تھی (دل کو یہ سمجھاتا ہے + دنیا پاگل خانہ ہے) کے ایک شعر (فطرت کے بیمار سبھی + شمع ہے پروانہ ہے) کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ ''ڈاکٹر پنہاں نے لفظ شمع کو غلط باندھا ہے۔ شعر پر نظر ثانی کرلیں'' لہٰذا ان کا بھی شکریہ فرض تھا۔ اور یہ بھی عرض کرنا چاہتی تھی کہ پروفیسر صاحب شاید مجھے اچھی اردو زبان و ادب کی اس اعلیٰ درجے کی طالب علم تصور کرتے ہیں جسے اشارہ کا اشارہ ہی کافی ہو۔ جب کہ میں ذرا بودی اور ناقص العقل قسم کی بہت معمولی سی بہت چھوٹی سی طالب علم ہوں اردو کی اور شاعری کی لہٰذا پوری وضاحت کے بغیر اس شعر کی خامی اور اس میں مستعمل لفظ ''شمع'' کے صحیح تلفظ کو نہیں سمجھ سکی۔ اور جب تک اپنی جہالت سمجھ میں نہ آئے تب تک ذہن اکتساب علم پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وضاحت کی مودبانہ درخواست ہے کھلے دل سے اس غلطی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وضاحت ہوتے ہی شعر میں ترمیم کرلوں گی۔ ترمیم اگر نہ کرسکی تو اس شعر کو غزل سے خارج کردوں گی اور نجفی صاحب کی شکر گزار رہوں گی کہ انہوں نے میری مدد اور رہنمائی فرمائی۔

پنہاں

گرامی القدر گلزار جاوید صاحب۔ سلام و رحمت!

زیر نظر شمارے میں قرطاس اعزاز ممتاز افسانہ نگار و ناول نویس قرۃ العین حیدر کے نام ہے۔ انہوں نے اپنی علمی و ادبی کاوشوں سے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہیں۔ ان کے حق میں اور ان کے خلاف معترضین ادب کے گروہوں سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام میں منفرد ہیں اور ان کی انفرادیت بھی اسی تخیل کی ہے جو کسی فنکار کو ادب کے یگانوں کی صف میں شامل کرنے کا جواز بنتی ہے۔ ان کا آج بھی ان کے کل کی طرح اہم ہے۔ وہ ''چہار سُو'' ہی کے نہیں ہر ادبی جریدے کے قرطاس اعزاز کی مستحق ہیں.....

''براہ راست'' اپنا معیار قائم رکھنے میں کامگار ہے۔ فنکاروں کے فن اور شخصیت کے تناظر میں وضع کئے گئے سوالات سے جس نوع کی ذہانت جھلکتی ہے وہ آپ کی طبع رسا کی شہادت دیتی ہے۔ قرۃ العین سے پوچھے گئے

سوالات میں بھی آپ نے اپنی طباعی کا ثبوت دیا ہے اور ان کی میئیتِ تنگ مزاجی کے باوجود ان کے فن اور شخصیت کی پرتیں کھولنے میں کامیاب رہے ہیں۔ یقیناً موصوفہ پر کام کرنے والے آپ کی کاوشوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکیں گے۔

مضمون "ایک قطرے کے لئے دل ڈوب گیا" قرۃ العین حیدر کا خود ان کے اپنے منفرد انداز میں تعارف کراتا ہے۔ اس تعارفی تحریر میں انہوں نے نے اپنا کوئی شخصی و ادبی گوشہ تشنہ نہیں رہنے دیا ہے۔ ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے قرۃ العین کو قرۃ العین کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے ناول "سفینۂ غمِ دل" پر وارث علوی کا تبصرہ یک رخا ہے جو ناول کی فنی کمزوریوں ہی کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرۃ العین کا یہ ناول ان کے دیگر ناولوں کے مقابلے میں کمزور ہے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ سرے سے اس میں کوئی خوبی موجود ہی نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ علوی صاحب ناول کی خوبیوں کی طرف بھی اشارہ کر دیتے تا کہ حقِ تنقید ادا ہو جاتا..... "عیب جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو"..... محمود ہاشمی نے قرۃ العین حیدر کے پہلے افسانوی مجموعے "ستاروں سے آگے" کو جدید افسانے کا نقطۂ آغاز کہا ہے۔ ان کے خیال میں اس مجموعے کے افسانوں میں پہلی بار کردار اور واقعات خطِ مستقیم میں چلنے پر مجبور نہیں ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بیانیہ اسلوب کا تخلیقی استعمال ہوا ہے اور اس نوع کے کردار تخلیق کئے گئے ہیں جنہیں اپنی ذات کے تناظر میں الفاظ اور اشیاء کے درمیان کوئی خلا یا فاصلہ محسوس نہیں ہوتا۔ الفاظ اور اشیاء انہیں ایسے استعارے لگتے ہیں جن کے نقوش مناظر میں ان کے باطنی احساس کی آواز موجود ہے۔ ہاشمی صاحب نے افسانوی منظرنامے اور داخلی احساس میں یکتائی کے حوالے سے ساقی اور قرۃ العین میں مماثلت دریافت کی ہے۔ ہم ان کی آرا پر صاد کرتے ہیں.....

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مضمون "قوموں کا تہذیبی تشخص" میں قرۃ العین کے فنی سفر کا اجمالی احوال بیان کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق قرۃ العین کی فکری سرحدیں ورجینا وولف کے نظریۂ زندگی کی سرحدوں سے ملتی ہیں۔ یعنی ان کی بیشتر تخلیقات میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے کہ "زندگی شعور کے آغاز سے انجام تک محیط روشنی کا ایک ہالہ ہے" قمر رئیس، قرۃ العین کی اس فنی دانش کا کھوج لگانے میں بھی کامگار ٹھہرے ہیں، جو قرۃ العین اور ان کے معاصر کہانی کاروں کے درمیان ایک فاصلے کا احساس دلاتی ہے..... قرۃ العین کی کہانی "سیتا ہرن" پر انتظار حسین کا تبصرہ بھی یک رخی ہے۔ انہوں نے بھی اس افسانے کے حوالے سے ان کی کہانی کاری کے محاسن سے صرفِ نظر کیا ہے اور اگر کہیں بیان بھی کئے ہیں تو معائب کے انداز میں۔ انتظار حسین خود ایک بڑے کہانی کار ہیں، اپنی ایک ہم عصر بڑی کہانی کار کی کوئی خوبی تو بیان کر دیتے..... "آگ کا دریا" قرۃ العین کا وہ ناول ہے، جس کا اردو کے معدودے چند شاہکار ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے اس ناول کا ایک معالجاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ قرۃ العین کے ناولوں پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں صرف نوابین، جاگیرداروں اور اوپری درمیانی طبقے کے شب و روز کی تصویر کاری کی گئی ہے اور گردوپیش کے عوام کی زندگی کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ "آگ کا دریا" پر یہ الزام صد فیصد صادق نہیں آتا۔ بقول اسلوب انصاری "ہر چند کہ اس ناول کا بیشتر حصہ اوپری درمیانی طبقے کی زندگی کی عکاسی پر مشتمل ہے لیکن اس میں عوام کی زندگی کے نقوش و خدوخال بھی واضح طور پر سامنے آتے ہیں....."

قرۃ العین کا شائع شدہ افسانہ "کارمن" بھی یہ شہادت دیتا ہے کہ قرۃ العین کو سماج و معاشرے کے ہر طبقے کی زندگی اور اس کے مسائل کا بھرپور شعور ہے۔ کارمن ایک متوسط طبقے کی لڑکی ہے، مگر عورت کی منفی نفسیات کا علامیہ بن کر سامنے آئی ہے۔ عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی، مرد کی فریب کاری کا شکار ہونے کے باوصف خوش گمانی کے حصار سے نہیں نکلتی اور اپنی سب سے قیمتی شے گنوا کر بھی خود کو باثروت سمجھتی ہے۔ کارمن ایک ناجائز بچے کو جنم دینے والی ہے مگر مطمئن ہے اور مرد کی ذات پر اعتماد کی اس نہج پر ہے جہاں تک جیسے ہوس پرست کو بھی اپنا خدا مان لیتی ہے۔ بورڈنگ ہاؤس کی ہر لڑکی کسی نہ کسی سماجی و معاشرتی مسئلے کی علامت ہے، جس کی طرف قرۃ العین نے بڑی چابک دستی سے اشارہ کیا ہے اور عوام کی زندگی کے حوالے سے اپنی مکمل آگہی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

"سیاہ فام" ڈاکٹر مشتاق عرفان کا ایک تاثر انگیز افسانہ ہے۔ یہ افسانہ طبعی تصورات کا آئینہ خانہ ہے جس میں افسانہ نگار کے خیالات کی مجسم شکلیں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ اس افسانے میں ڈاکٹر مشتاق نے اپنے کردار کے بطون ذات ہونے والی خود کلامی کو افسانے کے منظرنامے سے مہارتِ فن سے ہم آہنگ کیا ہے۔ دراصل سیاہ فام لوگوں کے بارے میں اس غلط و مدے حقی خیالات کا پرچار کیا گیا ہے کہ وہ مکمل طور پر Dmoralized ہو چکے ہیں اور لوتھر کنگ، لومبا، نیلسن منڈیلا، محمد علی باکسر ایسے لیڈروں کے تاریخ ساز کردار اور کارناموں کے باوصف اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے مایوس ہیں۔ نسلی امتیاز کا جبر بری طرح سیاہ فام شکار ہیں، شاید ہی کسی اور رنگ یا نسل کے لوگ ہوئے ہوں۔ افسانے کا واحد کردار سیاہ فام خاتون ہے، اور ان تمام complexes کا شکار ہے، جو سیاہ فام نسل کا مقدر کر دئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے مضمون "اقبال اور مسئلۂ تقدیر" میں ایک نہایت اہم مگر متنازع فیہ مسئلہ جبر و قدر پر علامہ اقبال کے افکار و خیالات کے تناظر میں قلم اٹھایا ہے۔ اس مسئلے پر فقہائے اسلام اور صوفیائے اسلام کے درمیان خاصا اختلاف ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے عالمانہ انداز میں اقبال کے نقطۂ نظر کی تفہیم کرائی ہے، جو ہمارے خیال میں قرآن و حدیث کی تعلیمات سے زیادہ قریب ہے۔

ارشاد احمد صدیقی نے "مرد خوبا" کے عنوان سے یادنگاری کی ذیل میں مضمون نہیں لکھا ہے بلکہ جو ہر میر کی یاد میں ایک دیا جلایا ہے اور اس کی لَو میں اپنا دل رکھ دیا ہے۔ صدیقی صاحب کا درج ذیل جملہ جوہر میر کی یاد میں ایک مکمل مرثیہ ہے۔

"وہ اپنے سارے آنسو لے کر چلا گیا، یہی اس کا اثاثہ تھا"

گلزار جاوید کا مقالہ "بیرونی ممالک میں اردو" دقتِ نظر سے لکھا گیا ہے۔ اس مقالے سے ان کی تحقیقی قوت کا ہمیں پہلی بار اندازہ ہوا ہے۔ جو بے پناہ ہے۔ ہندوستان میں منعقدہ 'عالمی اردو کانفرنس' میں ان کی شرکت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ملک کے اہم ادیبوں میں سے ایک ہیں۔

ناوک انصاری ایک بالغ نظر شاعر و نقاد ہیں۔ فنِ شعر پر انہیں مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کی رباعیات فکر و فن کے پیکر بن کر سامنے آتی ہیں۔ رباعی کے چوتھے مصرعے میں جس زور و توانائی کی ضرورت ہے، ان کی ہر رباعی میں اس کا التزام ہے۔ فرجہاں کی نظم "اپنے بچوں کے لئے" Imagination کا ایک ایسا فنی شعور سامنے لاتی ہے، جو انسانی جذبات و احساسات کی زیریں سطحوں تک رسائی رکھتا ہے۔ زرد پتوں کا آمادۂ سفر ہونا' گولوں کا نغموں سے ان کا جوبن چھین لینا یا الفاظ کے مفہوم کا مرجانا' ایسی images ہیں، جو ٹھوس (concrete) ہیں اور معانی و مطالب کے حوالے سے مبہم (Abstract) نہیں ہوتی ہیں۔ فرجہاں کی حیثیت قابلِ رشک حد تک متاثر کن ہے۔ دل نواز دل کی نظم "سوالی" اور فیصل عظیم کی نظم "مجھ پر سے چلا جاؤں" بھی ہمیں اچھی لگی ہیں..... غزل کے حصے کا ہم مطالعہ نہیں کر سکے ہیں..... معذرت!

قیصر تمکین

محترم المقام جناب گلزار جاوید صاحب،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جولائی و اگست ۲۰۰۵ء کا شمارہ "چہار سو" سیفی لائبریری میں قرۃ العین حیدر پر گوشہ کی شکل میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملا۔ گوشہ اگرچہ ظاہری اعتبار سے زیادہ تفصیلی نہیں لیکن معنوی اور حقیقی اعتبار سے قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ ویسے تو قرۃ العین حیدر کی شخصیت کسی کی تعارف کی محتاج نہیں لیکن پھر بھی ان کی ادبی شخصیت کے اس گوشے کے ذریعے کئی روشن پہلو سامنے آئیں گے جو قاری کے لئے باعث کشش اور مفید ثابت ہوں گے۔

"جاروں سے آگے" کے عنوان سے تذکرہ کشور وکرم نے قرۃ العین حیدر صاحبہ کا مختصر مگر بہت اچھا تعارف کرایا ہے۔ قرۃ العین حیدر صاحبہ سے لیا گیا انٹرویو بھی بہت معلوماتی ہے۔ انٹرویو کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دوران انٹرویو کسی بھی سوال کے جواب کے سلسلہ میں بے جا رعایت سے کام نہیں لیا بلکہ بلا اظہار خیال کیا ہے جیسا کہ انہوں نے برطانیہ وغیرہ میں اردو کے چلن کے متعلق کہا ہے کہ "ہندوستان پاکستان کے علاوہ جہاں جہاں اردو بولنے والے ہیں وہاں وہاں اردو کا چلن فطری بات ہے مگر یہ کہنا کہ فرانس، برطانیہ یا امریکہ میں اردو پھل پھول رہی ہے بالکل غلط ہے"

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب تک ہم اپنے بچوں کی اردو تعلیم کے بارے میں خود فکر نہیں کریں گے۔ اردو زبان کے پھلنے پھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں برطانیہ وغیرہ میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں جو حضرات کوشش کر رہے ہیں ان کا تعارف اور ان کی ہمت افزائی ضروری ہے۔

گل نشاں اور ابرکرم کے عنوان سے مختلف اوقات میں لکھی گئی ان کی تحریروں کے جو نمونے دیئے گئے ہیں ان سے ان کے ادبی سفر کے انداز کا پتہ لگتا ہے۔

وارث علوی، محمود ہاشمی، ڈاکٹر قمر رئیس اور انتظار حسین کے مضامین میں ان کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ایمانداری اور بے باکانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر صاحبہ اردو ادب بالخصوص فکشن کا وقار ہیں۔ آپ نے ان پر گوشہ شائع فرما کر ایک مستحق شخصیت کا قرض ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید اردو ادب کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد متین ندوی (سروج)

محترم گلزار جاوید صاحب

سلام و رحمت!

آپ کے حسنِ اخلاق کا یہ کرشمہ ہے کہ آپ سے وابستگی کا احساس ہمیشہ رہتا ہے۔ "چہار سو" کے تازہ شمارے مجھے ملے ہیں انشاء اللہ عنقریب سب دوستوں تک پہونچ جائیں گے۔ بلاشبہ آپ کی صلاحیتوں کا بھرپور عکس اس شمارے میں موجود ہے۔ محترمہ قرۃ العین صاحبہ بھی اس خصوصی شمارے سے کافی متاثر ہیں "انسان کا انسان تماشے کا تماشہ" چھاپ کر آپ نے بشیر بدر کی شخصیت کو اردو والوں تک پہونچایا ہے جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں اس کی دوسری قسط بھی آپ کو روانہ کر رہا ہوں۔ ملک زادہ منظور صاحب کو بھی میں نے "چہار سو" کا یہ خصوصی شمارہ دے دیا ہے۔ اب آپ ہر سال ادب کے سفیر بن کر ہندوستان آیا کریں۔ اس بار جب وعدہ آپ کا قیام میرے غریب خانے پر رہے گا۔ میری غزل کے تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ کتابت کی غلطی کے سبب "کیا" ہو گیا ہے جب کہ وہ "کیا" ہے۔ براہ کرم اسے نوٹ کر لیں ایک لفظ ادھر ادھر ہونے سے موضوعِ شعر یا مفہوم ہو گیا ہے؟

ملک زادہ جاوید